

# چھڑکیاں

علی پور علی پور اس کے کان میں آوازیں پڑیں۔

ایلی چونکا گاڑی ایک دھنچے سے رک گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ نام مانوں سا ہو۔ جیسے وہاں اسے کچھ کرنا ہو۔ اس نے سامنے دیکھا باجرہ ہوت کیس اٹھانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ وہ سامان اٹھانے لگا باہر پلیٹ فارم پر دھنڈ لکے کا ایک پھیلا اٹھا۔ اس پھیلا فیسیں گویا لوگ تیر رہے تھے۔ وروی والا بیوی با تھہ میں جھنڈی اٹھائے خور رہا تھا۔ سر پر بسترے اٹھائے وہ ایک سرخ اپوشن بہاؤ کو چیرتے ہوئے جا رہے تھے۔

دفعتا ایک چہرہ ان کی طرف بڑھا۔ قریب اور قریب اس چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

”تم ہو بہن۔“ پچھا عماد کہہ رہا تھا۔ ”تم کہاں گئے ہوئے تھے۔ محلے میں تمہاری ڈھونڈھ پھی ہوئی تھی۔ ہر جگہ پوچھ پچھہ ہو رہی تھی۔ جلدی پہنچو جلدی ورنہ وہ چلے گئے تو پھر کیا فائدہ میں ذرا موجو والی جارہا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک ڈبکی لگائی اور دھنڈ لکے میں گم ہو گیا۔

ڈھونڈھ پھی ہے۔ پا جردہ بڑا بڑا نے لگی۔ ڈھونڈھ کیوں پھی ہے۔ کیوں پھی ہے ڈھونڈھ پھی ہے۔ ڈھونڈھ پھی ہے۔ یکے کے پیسے چیخ رہے تھے۔ جب وہ بازار میں پہنچا تو دور سے حکیم نے انہیں دیکھا اور پھر اشارہ کرنے لگا۔ بہت سے لوگ جھک جھک کر مرمر کران کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دودھ والے کی دوکان پر لوگ ان کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔

ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ راجہ پورس ہو۔ اور منہ میں گاس لئے سکندر کے روپ و اعتراض شکست کرنے جا رہا ہو۔ ”مجھ سے ایسا سلوک کرو جیسا بابا داشاہ شکست خور دہ غلاموں سے کرتے ہیں۔“

وہ محسوس کر رہا تھا کہ ان سب کو اس کی شکست کا علم تھا۔ وہ اس کے منہ کے گھاس کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کی شکست پر خوش تھے۔ لیکن وہ سکر ندر کون تھا جس کے روپ و پیش ہونے ایسی جارہا تھا۔ نہ جانے کون تھا۔ بہر حال وہ سکندر تھا وہ فاتح تھا وہ اس کا منتظر تھا۔

چوگان میں انہیں ماں دیکھ کر رک گئی اس نے ہونٹوں پر انکی رکھلی۔

”ہے تم ہاجرہ۔“ وہ چلانی ”جو جی کی ماں لویں ہے۔“

”کون ہے؟“ ایک کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔

”کیا کہا ماں۔“ دوسرا بھائی چلانی۔

”ہے ہاجرہ تم ہو کیا۔“

”اب کیا ماں بیٹا نیا گل کھلا کر آئے ہیں۔“

”میں کہتی ہوں، بہن پرانے بندھوں کا بھی خیال کر لیا کرو۔ کب تک آگے دوڑ اور پچھلے چوڑ پر عمل کرو گی۔“

”تو تو ہاجرہ لڑکے کے پیچھے دیوانی ہو گئی۔“

ہاجرہ حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کی تعداد ہر ساعت بڑھتی جا رہی تھی کوئی گلی سے نکل کر رک جاتی کوئی کھڑکی سے سر نکالتی۔ کوئی چھٹ سے جھانکتی چند ساعت تو ایسی کھڑا خرت سے ان کی طرف دیکھتا رہا پھر وہ بھاگا اندھا دھنڈ بھاگا۔ اس نے محسوس کیا جیسے قبرستان میں داؤں نے اسے گھیر لیا ہو۔

”سہہنے تم،“ رابعہ نے ایسی کو دیکھ کر سینہ تھام لیا۔ اس کی آنکھیں ابل آئیں اور وہ حیرت سے بت بنی دیکھتی رہی۔

ایسی ڈرگیا \_\_\_\_\_ نہ جانے کیا بات۔

”تو تم ہے؟“ \_\_\_\_\_ جانو اسے دیکھ کر ٹھٹھکی اور اس نے چیخ سئی ماری شہزاد کے ہاتھ سے پیاںی اگر پڑی اور فرش پر ٹوٹ کر رینہ رینہ ہو گئی۔ اس کے قریب ہی

صفدر کھڑا حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ چند قدم پرے بیگم اسے گھور دیا تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے مر جانے کے بعد بدرجہ کی شکل میں واپس آیا ہوا وہ سب ڈراور حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے ہوں۔

دیر تک بات کے بغیر وہ اس کی طرف دیکھتے رہے اتنی دیر میں ہاجرد بھی آپنی۔

”سب سے پہلے رابعہ بولی۔“ ہے ایک گھنٹہ پہلے آجائے تو

”اتنے دن تمہاری ڈھونڈھ پڑی رہی۔“

”انتظار میں راہ نکلنے رہے۔“

”ہے لتنا ظلم کیا تام نے۔“

”اتنی دیر لگادی تم نے۔“

”آخر ملتان میں گیوں رکے رہے۔“

وہ سب باری باری بول رہے تھے۔ ایلی کون ان کی باقی میں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ نہ جانے وہ کس بات پر اظہار افسوس کر رہے تھے۔

پھر رابع نے ٹلسما توڑا ”ہے اتنی پیاری ہے وہ کہ کیا بتاؤ۔ اتنی رونق لگا رکھی تھی اس نے وہ تو یوں گھل مل گئی جیسے آج میں سے ہوا تھی اچھی طبیعت مزانج نہیں ہونگیں خوش خوش طبیعت۔ پس مکھ۔ تم تو اتنے خوش قسمت ہو وہ ایلی کی طرف دیکھ کر بولی۔

”یہ تو سکندر کا نصیب لے کر آیا ہے۔“ شہزاد بولی۔

”ہے اب جلدی کرو جلدی، نیک کام میں دیر نہ کرو۔“

”لووہ اپنے منہ پھٹ ہونا بھی کیا۔“ بیگم نے جل بھن کر کہا۔  
ایلی نے غور سے بیگم کی طرف دیکھا۔

”اونہ کیا دیکھتا ہے،“ شہزاد بولی۔ اماں اور کیا کہے گی۔“ وہ فہمی۔

”اور بہن اتنی خوبصورت اور پھر اتنی اچھی۔“

”یہ تو ساری مر مٹی ہیں اس پر،“ شہزاد بولی۔

”کوئی ایسی بات کرو جو میرے پلے بھی پڑے۔“ باجرہ بولی۔ ”کس کی بات کر رہی ہو۔“

”اے وہ آئے تھے۔“ جانو نے کہا۔

”کون آئے تھے؟“

”آئے ہے وہی لاہور والے کیا نام ہے اس لڑگی کا۔“

”اے سادی اور کون۔“ رابعہ بولی۔

”سادی۔“ ایلی کا دل ڈبو گیا۔

”سادی،“ باجرہ نے زیر لب کہا۔ ”کہاں آئے تھے۔“

”یہاں یہاں علی پور میں شہزاد کے حصہ پورے دو دن رہے۔“ رابعہ چلائی۔

”تمہارا انتظار کرتے رہے۔“ جانو بولی۔

”وہ اس کی بہن اور اس کی خالہ۔ تینوں۔“

”یہاں آئے تھے؟“ باجرہ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں ہاں یہاں یہاں یہاں یہاں دو دن یہاں رہے وہ۔ اتنی پیاری ہے وہ سادی اتنی نگین اور اس قدر پیار کرنے والی اور پھر خوبصورت کوئی جواب ہے اس کا“ رابعہ نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

### نمناک دھندا کا

ایلی کا دل دھک سے رہ گیا۔ آنکھیں دھندا لگیں۔ پانی ہی پانی پانی پانی چاروں طرف پانی اور اس پر ٹنگا ہوا پھیکا اوس آسمان قریب ہی کوئی چیخ کر بولا ”گاڑی آگے نہیں جائے گی۔“

ایلی دیوانہ وار بھاگا فرحت کے کمرے میں پہنچ کر وہ دھم سے چار پانی پر گر پڑا۔ اس نے اپنا منہ تکیہ میں ڈبو دیا۔ پانی ہی پانی تکیہ بھیگ گیا۔ اس نے سراٹھایا کمرہ نمناک دھندا کے سے

بھرا ہوا تھا۔ دو رہا جرہ سہی ہوئی کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ دھنڈ لگائی ایک روز جوں کا توں قائم رہا۔

مايوسی بڑھتی گئی پھر مايوسی کے اس تاریک آسمان پر دفعتاً گویا امید کا ایک تاراً ٹوتا۔ ایک ساعت کے لئے روشنی کی گز جنملائی۔  
نہیں نہیں سادی ضرور کچھ کرے گی، وہ گھروالوں پر اثر ڈال سکتی ہے اس کی والدہ اس کا ساتھ دے گی۔ اور پھر سارے کیراموز و غصے میں غرانے کے بعد روپڑیں گے منصر جوش میں بہن کی اس دیدہ ولیری پر اسے مارپنے کیلئے ہاتھ اٹھائے گا اور پھر اسی ہاتھ سے اپنے آپ کو پینے لگے گا اور بالآخر وہ پھوٹ پھوٹ کر روپڑے گا اور جوش محبت سے سادی سے بغلیب ہو جائے گا اور پھر جب وہ ایلی سے ملے گا تو کہے گا۔ ”ایلی صاحب اتفاق سے“

لیکن جلد ہی ٹوٹتے تارے کے وہ روشن ڈرات بکھر گئے روشنی بھگنی اور وہی تاریکی چھا گئی۔

”نہیں نہیں اس معاملے میں مجبور ہوں۔ میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں کہ اس بارے میں خندنیں کروں گی۔“ سادی چلاتی۔ ”خاندانی عزت“ وہ طنز سے ہنسی ”ان کی مجبوریاں بھی آخر تسلیم کرنی پڑتی ہیں۔ ہاں اس معاملے میں مجبور ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دور ہٹے چلی جاتی اور دوڑ اور دوڑتی کہ جوں جوں وہ دور ہوتی جاتی تاریکی چاروں طرف سے یورش کرتی۔

منظراً باد سے آنے کے بعد وہ چند رہ روز کے لئے تو ایلی بے حد پریشان رہا اس کے دل میں کئی مرتبہ خیال پیدا ہوا کہ سادی کو ساری بات لکھ دے تا کہ وہ حالات سے واقف رہے لیکن پھر اسے خیال آتا کہ یہ بات خط میں لکھنے والی نہیں۔ بلکہ زبانی کرنے والی ہے الہدا وہ سوچتا ہا کہ کیسے بات کرے ملنے کی کوئی صورت بھی تو نہ تھی۔

آخر اس کے صبر کا پیانہ لبریز ہو گیا۔ شاید صورت پیدا ہو جائے آخر کوئی نہ کوئی صورت تو پیدا ہو گی ہی۔ لیکن اس کالا ہور جانا ضروری تھا۔ علی پور میں بیٹھتے تو صورت پیدا نہیں ہو سکتی وہ سادی کے خط کے انظر میں تھا۔ خط سے حالات کا کچھ تو علم ہو گا۔ وہ علی پور کیسے آئے تھے۔ کیا چوری آئے تھے یا سب کو علم تھا یا ممکن ہے صرف اماں سے بات کی ہو اور پھر علی پور آنے کے بعد ان کے تاثرات کیا تھے لیکن سادی کا کوئی خط موصور نہ ہو رہا تھا۔ ہر روز ایلی امید لگا کر بیٹھ رہتا۔ واکیہ کی آمد کے وقت ہر آہٹ پر اس کے کان بجھتے لیکن سادی کا خط موصول نہ ہوا۔ اب مزید انتظار کرنا ممکن نہ تھا۔ لہذا اس نے لا ہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔

All rights reserved  
© 2002

گاڑی میں وہ مختلف قسم کے منصوبے بناتا رہا۔

لا ہور پہنچتے ہی ایسے وقت سفید منزل جاؤں جاؤں جبکہ گھر کوئی نہ ہو۔ منصر دفتر دفتر گیا ہوا ہو۔ انور کالج میں ہو ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی صورت نہ نکلے۔ ممکن ہے امان آیا ہوا ہو۔

فرض کیجیے گھر کوئی نہ ہو پھر بھی والدہ تو ہوں گی۔ اور اب شاید وہ سادی کو اس کے سامنے بلا ناپسند نہ کریں۔ بلا بھی لیں تو وہ ان کے سامنے یہ بات کیسے کہے گا۔ بات کی نوعیت ایسی ہے کہ کسی کہ رو برو نہیں ہو سکتی۔ باجی کے رو برو بھی نہیں تو پھر اگر وہ ایک مرتبہ سفید منزل میں چلا گیا تو پھر سب کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ لا ہور آیا ہوا ہے۔ اس کے بعد سادی سے خفیہ ملاقات کی صورت نہ رہے گی اور اگر سفید منزل نہ جائے تو پھر سادی کو خفیہ پیغام بھیجنा ممکن نہیں۔

ایلی اسی اویٹر بن میں مصروف تھا کہ گاڑی لا ہور کے سینیشن میں داخل ہو گئی ایلی ہو گئی ایلی گاڑی سے اترًا۔

ہوٹل میں سامان رکھ کر وہ سید حاصفید منزل پہنچا۔ صدر دروازہ بند تھا۔ اس نے دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے پھر دستک دی۔

نج ایلی نے تیسری مرتبہ دستک دی تو بولڑ حاسقة جو گلی سے گزر رہا تھا نہ کر بولا ”میاں دستک تو دے رہے ہو پرواجے پر تو تالا پڑا ہے۔“

”لیکن، وہ چلا یا“ یہ لوگ کہاں ہیں۔“

”میاں کہیں گے ہوں گے۔“ سقد نے کہا۔

دیر تک ایلی ویسیں لھڑا رہا کہ کسی سے پوچھے لیکن کوئی اور سے نہ گزرا۔ ساتھ والے گھر کا دروازہ لٹکھا کر پوچھنے کی اس میں جرأت نہ تھی۔

شام کو وہ منصر کے ففتر میں پہنچا لیکن وہاں بھی تالا گا ہوا تھا۔ امرے ”وہ حیرانی سے چلا یا“ یہاں بھی تالا نہ مانے دو کان پر جا کر ان نے پنواڑی سے پوچھا۔

”کیوں بھی یہ فتر نہیں کھلے گا تجھے؟“

”یہ فتر پنواڑی بولا رہا“ یہ فتر تو بعد ہو گیا بابو دی۔

”بند ہو گیا۔“

”جی آٹھ رو ج ہونے بند ہونے اے۔“

”بند ہو گیا۔“

”جی آٹھ رو ج ہونے بند ہونے اے۔“

”کیا کسی اور جگہ چلا گیا۔“

”یہ تو مالم بابو۔“

دو کامدار کی بات سن کر ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے روپ و راک ہنی دیوار اکھڑی ہو۔

ہوٹل میں پہنچ کر ساری رات وہ سوچتا رہا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس سے دریافت کرے منصر کے دوستوں سے وہ واقف نہ تھا۔ اگر چہ اسے معلوم تھا کہ موٹی دروازے کے ایک محلے میں ان کے رشتہ دار رہتے تھے جہاں رانا کی شادی پر وہ گیا تھا۔ اسے وہ راستہ اچھی طرح یاد تھا۔ لیکن آخر وہاں جا کر وہ کس کا دروازہ لٹکھائے

کس سے پوچھئے اور اگر انہوں نے پوچھا میاں تم کون ہو تو وہ کیا جواب دے گا۔

پھر دفتار سے خیال آیا ڈاکٹر جس نے دوپٹے کی چوری کے موقع پر اسے تسلی دی تھی۔ ”مجھے سب معلوم ہے گھبراو نہیں۔“

صحیح سویرے ہی ڈاکٹر کے مکان پر جا پہنچا۔  
”معاف کیجیے۔ وہ بولا۔ ”آپ کو تکلیف دی۔“  
ڈاکٹر سے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ ”کیوں کیا پھر دوپٹے چڑانے کا راوہ ہے۔“  
”بھی نہیں، ایلی مسکرا کرایا۔“

”لیکن اب تو وہ پٹے چڑانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ لوگ تو چلے گئے۔“

”چلے گئے؟“ ایلی نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیوں؟“

”انہوں نے یہ مکان بیچ دیا۔ منصر صاحب نے فتر میں استحقاء دے دیا اور وہ ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلے گئے ہیں۔“

”ہمیشہ کیلئے؟“ ایلی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

”منصر صاحب کے والد کسی ریاست میں اوپنج عہدے پر فائز ہیں۔“ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا ”اس لئے غالباً انہوں نے سب کو ہیں بلا لیا ہے۔“

”لیکن۔“ ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

ڈاکٹر نے اسے تھکننا شروع کر دیا۔ ”میرے نوجوان دوست زندگی میں ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ شروع شروع میں انسان دکھسوں کرتا ہے یہ عمر ہی ایسی ہے پھر آہستہ آہستہ۔“ ”وہ مسکرا کرایا۔“ وہ سب ٹھیک ہو جائے گا وقت لا جواب مرہم ہے۔ چائے پینیں گے آپ۔“

”شکریہ۔“ ایلی گلنگیا اور گردن لٹکا کر چل پڑا۔ اسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے سلام علیکم کئے بغیر شکریہ ادا کئے بغیر چل پڑا تھا۔ اس کے روپرو ایک خونفاک دھندا کا پھیلا ہوا تھا تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ مناظر اپنا مفہوم کھو

چکے تھے آوازیں محض شور و نسل میں تبدیلی ہو چکی تھیں۔ لاہور ملے کا ایک ڈھیر دکھائی دے رہا تھا اس کے رو برو ناؤ گھر تھا۔ لیکن ناؤ گھر گویا ریت میں وہنسا ہوا تھا۔

— ریت ریت ریت — نمناک وہند لکا اور ریت !!

## والد صاحب

سادی کے یوں اطلاع دیئے بغیر چلے جانے پا یا غم نہیں بلکہ حیرت محسوس کر رہا تھا کم از کم اسے اطلاع تو دی ہوتی۔ سادی کو اس کے گھر کے لوگ جانے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ ممکن ہے گھر والوں نے چالاکی سے اسے بہلا پھسلا کر رضا مند کر لیا ہوا وہ دھوکے میں آگئی ہو شاید منصر نے جان بلو جھ کر ان کو کوئی سے استغصے دے دیا ہوتا کہ ان کے لاہور میں ہر بیٹے کا جواز نہ رہی ہے اور یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہو کہ ایلی سے سادی کا جذبائی تعلق ثوٹ جانے نہ بھی تو اُٹے تو اس میں شدت نہ رہے۔  
دوری اور وقت مل کر اس کی توجہ کو کسی اور طرف منعطف کرنے میں مدد ناہیت ہوں۔  
جب اسے یہ خیال آتا تو دکھ محسوس ہوتا۔ دراصل ایلی کو منصر سے محبت ہو چکی تھی۔ منصر اس کا آئینہ میں بن چکا تھا۔ اور منصر کی حیثیت سے ایلی کے ذہن میں اگر سادی سے زیادہ نہ تھی تو کسی صورت میں اس سے کم بھی نہ تھی۔

منصر کا وہ حسن اس کا بانکپن رکنیتی طبع اس کی خود اری اور اس کے علاوہ منصر کی شخصیت سے خلوص بھری محبت کی کی شعاعیں سی نکلتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں ایسی شعاعیں جو دکھتی نہیں بلکہ محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے بلا کی سردی میں کوئی انجمانی انگیٹھی کے پاس جا بیٹھا ہو۔

ایلی کی سب سے بڑی بد قسمتی یہ تھی کہ وہ در پر وہ منصر سے محبت رچا بیٹھا تھا حالانکہ سادی نے کئی بار خطوط کے ذریعے اور زبانی اسے خبردار کیا تھا۔ ”و یکھنا یہ نہ بھولنا کہ یہ سب لوگ صرف میری وجہ سے \_\_\_\_ آپ سے التفات محسوس کرتے ہیں۔ صرف میری وجہ سے ورنہ ان کا بس چلتے تو \_\_\_\_“ سادی کی تنبیہ

کے باوجود ایلی منصر کا ہو چکا تھا۔ وہ منصر کی ہدایات پر عمل تو نہیں کرتا تھا لیکن ان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسے تکلیف محسوس ہوتی تھی۔

”نہیں نہیں“، وہ آپ ہی چلایا ”منصر ایسا نہیں کر سکتا۔ منصر اسے دھوکا نہیں دے گا۔ ضرور مجبور پیش آگئی ہو گی کہ نہیں لاہور کو خیر باد کہنا پڑا ورنہ منصر اگر قطع طلاق ہی مقصود ہوتا تو وہ اعلانیہ کہہ دیتا۔“ ایسا صاحب اگر آپ سادی کے راستے سے ہٹ جائیں تو میں بے حد ممنون ہوں گا۔ پھر ایسی چال چلنے کا فائدہ۔ نہیں نہیں منصر ایسا نہیں کر سکتا۔“

کئی ایک روز ایسیں اس طبقے پر سخیدگی سے سوچتا رہا۔ مگر زیادہ سوچنے سے بات اور بھی پچیدہ ہو گئی تھی کہ وہ اپنے لرڈ کیا۔ پھر سادی کا خط موصول ہوا۔ لکھا ہوا تھا ”بھائی جان کی وجہ سے میں مجبور ہو گئی۔“ بھائی جان کے لئے اس کے سوا اور چارہ کا رشتہ تھا کہ لاہور چھوڑ کر یہاں ریاست گردکل میں آ جائیں مجھے بھائی جان سے محبت ہے۔ آپ جلتے ہیں تو پڑے جائے۔ میں بھائی جان کیلئے سب کچھ قربان کروئیں کے لئے تیار ہوں چاہے میری جان ہی کیون نہ جائے۔

لیکن گھبرائی نہیں ہمارے یہاں آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ اپنے والد صاحب سے بات کر کے ان کے ہاتھ پیغام بھیجنے میں سستی نہ کریں چونکہ میرے والد صاحب پڑے رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں اور ابا کے سامنے اپنی وال نہیں گلتی لہذا یہ کام تو آپ کو کرنا ہی ہو گا۔

”یہاں کب آئیں گے آپ کے منتظر ہوں گی منتظر ہوں۔“

سادی کا خط پڑھ کر ایلی کو خوشی کی بجائے النغم ہوا اور وہ بالکل ہی ما یوس ہو گیا۔ ”والد صاحب“، وہ زیر لب بولا ”پڑے رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں۔ والد اونہہ“، اس کا جی چاہتا تھا کہ قہقہہ مار کر نہیں پڑے اور دیوانہ دار چلانے

”والد صاحب ہاہاہاہا۔“

”والد صاحب۔ والد صاحب بڑے رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں۔ ہاہاہاہا۔“

”والد صاحب۔ والد صاحب کے سامنے ہماری دال نہیں گلتی۔ ہی ہی ہی۔“

”والد صاحب سے کون بانت کرے۔ اور کی بھی جائے تو کسی احسن طریق سے کی جائے۔ والد صاحب کی رضامندی ضروری ہے۔ انہیں خود پیغام لانا چاہئے۔“

”نہیں مجھے یہ رشته منظور نہیں \_\_\_\_\_ میں چاہتا ہوں کہ بچوں کا رشتہ ایسے گھرانوں میں ہو جہاں میری حیثیت ہو۔ میری عزت ہو۔ میری آؤ بھگت ہو۔ میری عزت \_\_\_\_\_ بابا بابا۔“ والد صاحب۔

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ دیوانہ مار براہن کل جائے اور لوگوں کو اپنا پیغام سنائے ”تمہارے یہاں والد صاحب ہیں وہی۔ ان سے بچو۔ والد صاحب سے فتح کر رہو۔ ان سے دور رہو۔ وہ ایک جیتنی جاگتی لعنت ہیں۔ بد قسمتی ہیں۔ ان کا رکھ رکھاؤ جھوٹ ہے ان کی خاندانی عظمت فریب ہے۔ والد صاحب ایک بہروپیہ ہیں جو فریب سے گھر کی گدی پر آجیستھے ہیں۔ والدہ محترمہ نے اگر انہیں سرچھار کھا ہے تو کسی ذاتی غرض کی وجہ سے والدہ محترمہ نے اپنی آسانی کے لئے انہیں بت بنا رکھا ہے توڑ دوان بتوں کو توڑ دو۔“

بچپن ہی سے ایلی کو اپنے باپ سے بہر تھا۔ اسے علی احمد کو دیکھتے ہی غصہ آ جاتا تھا۔ باپ کی وجہ سے ہی وہ والدین کی محبت سے محروم رہا تھا۔ باپ کی وجہ سے وہ نو کرائی کا بیٹا تھا باپ کی وجہ سے اسے سستی اور کمینی عورتوں کے لئے چلچلاتی دھوپ میں بوتل میں رہہت سے پانی بھرنا پڑا تھا۔ باپ کی وجہ سے محلے والیاں کہا کرتی تھیں ”بہن آخر بیٹا کس کا ہے اپنے باپ کے قدموں پر چلے گا اور کیا وہ بھی گودی میں پلا تھا۔ یہ بھی گودی میں پل رہا ہے۔“

اور والد صاحب ہی کی وجہ سے آج ایلی کے ہاتھ سے سکون اور اطمینان سے

زندگی بس کرنے کا موقعہ ہمیشہ کے لئے جا رہا تھا۔ اگر سادی چھن گئی۔ اگر اس کی پناہ گاہ ہاتھ سے جاتی رہی تو تو تو ایلی نے دانت بھینج لئے تو تو میں گندی بدرو میں چھلانگ لگا دوں گا۔ میں اپنا آپ کتوں کو کھلاؤں گا۔ میں اپنے قفن کو چاروں طرف پھیلا دوں گا۔ میں بھی گود میں پاؤں گا۔ میرے کمرے میں بھی مین کا سپاہی برسر پیکار ہے گا والد صاحب زمہ باد پاکندا ہا۔

### برہمنہ نگاہ

پھر جو ایلی کو ہوش آیا تو اس کے سامنے ہاجردہ اور فرحت سمجھی ہوئی کھڑی تھیں۔

”کیوں ایلی، ہاجردہ کہہ رہی تھی“ خیر لڑکے۔  
”خیر“ اسے بات سمجھیں نہیں آ رہی تھی۔

”تختے کیا ہوا ہے ایلی،“ فرحت پوچھ رہی تھی۔

”مجھے“ وہ بولا ”کیوں؟“

”تیری چینیں تو سارے محلے میں سنائی دے رہی تھیں بیٹا۔“

”چینیں“ اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

”نہ بیٹا،“ ہاجردہ قریب آ کر بولی ”خود کو اختیار میں رکھا کرتے ہیں۔ اللہ کرے گا کوئی نہ کوئی صورت نکلی ہی آئے گی۔“

”وہ تو خیر نہ جانے کب نکلے گی۔ لیکن جو صورت نکلی ہوئی ہے اسے تو دیکھو ذرا،“ شہزادہ داخل ہو کر بولی۔

”کیا نکلی ہوئی ہے؟“ ہاجردہ نے کہا۔

”یہ،“ شہزادہ نے بڑھ کر ایلی کی ٹھوڑی کو دنوں باہموں سے پکڑ لیا۔

”اب تو تو بھی نہیں آتی۔“ فرحت بولی۔ ”آج نہ جانے کتنی دیر کے بعد شکل دکھائی ہے۔“

”میری شکل\_\_\_\_ ” وہ نہیں ”میری شکل دیکھ کر پہلے تم کب خوش ہوا کرتی تھیں صرف ایک ایلی تھا اور اب اسے اپنی سدھ بددھ نہیں رہی \_\_\_\_ کیوں ایلی ” وہ چلائی۔

”اپنی سدھ بددھ پہلے کب تھی؟“ ایلی تھا اسے چھیرا۔  
”اچھا“ اس نے منہ لپا کر کے جواب دیا ”میں تھیں پہلے تھی۔“  
”اگر سمجھ لیتی تو بات نہ گزرتی۔“ ایلی نے کہا۔  
”تستت\_\_\_\_ تم نے ہی سمجھا دیا ہوتا“ وہ نہیں ”پھر تجھے چائے پاؤں بیہاں اکیا بیٹھا رہتا ہے فضول چل۔“ شہزادہ نام سے پکڑ دیا۔  
ایک ساعت کے لئے ایلی نے شدت سے ہوں گیا کہ سب کے رو رہ شہزادو کو اپنے بازوؤں میں جکڑ اور اس کا بند بند چومنا شروع کر دے اور پھر چلا کر کہے ”چل اگر یہی ہے تو یہی سہی۔“

اس نے شہزاد پر ایک بہنے نظر ڈالی اور اس کی طرف بڑھا۔  
شہزاد بھانپ گئی اور پھدک کر پیچھے ہٹی اور پھر بھاگی۔ ”آؤ نا پھر“ وہ چلائی۔ ”جلدی آؤ“ ایلی بھاگا۔

اس وقت نہ جانے ایلی کو کیا ہو گیا تھا۔ اس وقت گویا وہ اپنے آپ میں نہ تھا۔ جیسے کوئی اور روح اس کے جسم میں حلول کر گئی تھی۔ وہ بھول چکا تھا کہ ہاجرہ اور فرحت کھڑی دیکھ رہی ہیں وہ بھول چکا تھا کہ شہزاد اشریف کی بیاہتا بیوی ہے وہ بھول چکا تھا کہ اسے ساوی سے محبت ہے وہ اپنا آپ بھول چکا تھا۔ اس وقت اسے کسی فرد یا اصول کا لاحاظہ نہ تھا۔ وہ ننگا تھا۔ شرم و حیاء سے قطعی طور پر بے گانہ۔ اسے صرف ایک خواہش تھی۔ کے اعلانیہ اپنے آپ کو کنوئی میں میں پھینک دے اور پھر بھینس کی غلاظت میں لٹ پت ہو جائے۔ اس کا شدت سے جی چاہتا تھا کہ سب کے رو رہو اپنی تذلیل کرے۔ سب کے رو رہو کسی کی تذلیل کرے۔

شہزادے نے مرکرا میلی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خوف سے بھیانک ہو رہا تھا۔ یا شاید ایلی کی وہ خواہش شہزاد پر بھی اڑ کر چکی تھی۔ اور اس کا چہرہ نہیں بلکہ کسی اور جذبے سے بھیانک ہو رہا تھا ممکن ہے دونوں ہی باتیں درست ہوں اور ایلی کے قرب سے خالق تھی اور اس کی آرزو کر رہی تھی۔

اگر اس وقت بیٹھیوں میں ایلی کا پاؤں نہ پھسلتا اور وہ دھرم سے نہ گرتا تو اس کی زندگی میں واقعات کا دھارا کسی اور رخ پر چل پڑتا حالات فیکروٹ لیتے۔ لیکن گرتے ہی اس کی وجہ پوت کی طرف مبذول ہوئی اور اس کو یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ شہزاد اس پر جھکی ہوئی ہے اور اسے اسی برہنگاہ سے وکھرائی ہے۔

پچھے دیر کے بعد ایلیں چار پالی پر بیٹھا ہوا تھا وہ خلاصے خیال آیا کہ اس وقت اسے کیا ہو گیا تھا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ عجیب سی وحشت تھی عجیب سی اس وقت اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے شہزادہ کا پھٹکہ ہوا اور وہ خود پیچھے کتنے خطرناک عزم لئے وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور شہزادے جب مرکرا اس کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہ میں کس قدر خوف تھا۔ لیکن اس خوف میں لذت کی جھلک تھی وحشت بھری لذت اور پھر وہ نگاہ جو شہزادے اس پر ڈالی تھی جب وہ گر پڑا تھا۔ کیا شہزاد خواہش کے جمذوبانہ اظہار کو پسند کرتی تھی لیکن وہ تخلیے میں بھی خواہش کے اظہار سے گھبراتی تھی وہ تو آرزو کی ہلکی چلکی کی ولدوہ تھی۔ موسلا دھار بوجھاڑ کو وہ کیسے پسند کر سکتی تھی۔ لیکن اس وقت ایلی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

کیا سمجھی عورتیں ایسی ہوتی ہیں آرزو کے بلکے سے اظہار کو نہ پسند کرتی ہیں۔ بر امانتی ہیں۔ لیکن مجتنا نہ وحشت بھری خواہش کے اعلانیہ اظہار کے روپ و انکار کو رکھا و احتیاط ضبط سب پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی نگاہ میں فخر بھری انبساط جھلکتی ہے اور ایک ساعت کے لئے وہ تمام دنیا اور پاہندیوں سے آزاد ہو جاتی ہیں۔

ایلی نے کئی ایک مرتبہ دیکھا تھا کہ وہ شہزاد جو خواہش کے عملی اظہار سے ڈرتی تھی۔ اور تخلیکے میں بھی اس سے بچنے کی کوشش کیا کرتی وحشت بھرے اعلانیہ اظہار پر اس میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی جیسے سانپ کو دیکھ کر چوہا بہوت ہو کر بے حس ہو جاتی ہے اور پھر اس عالم میں شہزاد لوگوں جو جاتا تھا اور وہ بے پروا بے خوف ہو کر میدان میں آ کھڑی ہوتی دعوت دیتی کہ وہ وحشت طوفان بن کر چلے لیکن ایسے موقع پر ایلی ٹھہر اجاتا تھا۔ اور قدم پیچھے ہٹا لیتا تھا۔ یہ دیکھ کر شہزاد کے انداز میں ہلکی سی تحقیر جھلکت جیسے کہہ رہی ہو۔ لیس اتنی ہی جرات تھی۔ سادی نے ایلی کو صرف اس لئے پسند کیا تھا کہ اس نے دو تین مرتبہ جرات کا اظہار کیا تھا۔ مثلاً جب اس نے ضد سے سادی کا سلاکا ہوا سگرٹ حاصل کیا تھا۔ وہ پہلے چھیننا تھا اور اس رات جب وہ بھاگنے کے بعد سفید منزل میں لوٹ آیا تھا۔ سادی کتنی عظیم شخصیت تھی اس کی وہ بے نیازی وہ بھی وہ نگینی۔ ایلی نے آہ بھری۔ نہ جانے کیوں رات کے اندر ہیرے میں تن تھا سادی کے اس قدر قریب ہونے کے باوجود اس نے کبھی خواہش محسوس نہ کی تھی وحشت اور مجد و بانہ اظہار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ سادی کے متعلق سوچتا تو ایلی کا دل بیٹھ جاتا۔ اسے دکھ ہوتا اور اس کی توجہ پھر والد صاحب کی چرف مبذول کرے اور یوں اپنے آپ کو محفوظ کر لے۔ لیکن اس کی توجہ مبذول نہ ہوتی اور وہی دیوانہ پن اس پر مسلط ہو جاتا۔ اور اس کا جی چاہتا کہ ساری دنیا سے انتقام لے۔ اپنے آپ تباہ کر دے۔ کسی اندر ہے کنویں میں چھلانگ لگادے اور بھینس کی طرح غلامت میں لٹ پت ہو جائے۔ اس وقت شہزاد کرا یلی کی طرف دیکھتی اس کی آنکھوں میں وحشت بھرا خوف جھلکتا جو دغدا وحشت بھری لذت میں بدل جاتا۔ اور وہ گرے ہوئے ایلی کی طرف بڑھتی۔ اس کے کپڑے تارتار ہو جاتے۔ وجہیاں ہوا میں اڑتیں۔ شہزاد کے بالوری جسم سے گلابی شعاعیں نکلتیں اور قریب اور قریب۔ اور قریب پھر نشے اور رنگ

کی ایک بوچھاڑ پڑتی اور وہ لٹ پت ہو جاتا۔

ایلی کے دل میں ایک پوشیدہ خوفناک عزم پیدا ہو رہا تھا۔ جس کی نوعیت سے وہ خود بھی واقف نہ تھا۔

جب وہ چلنے پھر نے کے قابل ہوا تو ایک روز سوچنے سمجھے بغیر وہ ہاجرہ سے کہنے لگا۔

”اماں میں امرتر جاؤں گا۔“

”امرتر جاؤں گا“ ہاجرہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ”امرتر کون ہے؟“ وہ بولی ”کس کے پاس جاؤ گے؟“

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہبھاں ایک نوکری ہے۔“

”نوکری“ ہاجرہ نے سینہ تھام لیا اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ”ہے تجھے نوکری مل جائے تو کتنا اچھا ہو۔ تیراخیاں بٹ جائے۔ شغل میں لگ جائے اور ہمیں چار پیسے مل جائیں۔ اتنا فرض ہو گیا ہے سر پر۔“

”نوکری۔“ فرحت مسکرائی۔ ”نوکری گھر بیٹھے تو نہیں ملتی انسان تلاش کرتا ہے جو تھا تاہے تو کہیں ملتی ہے۔ لیکن یہ تو اور باتوں میں کھو یا بیٹھا ہے۔“

”اب تو چھوڑ اس بات کو۔“ ہاجرہ بولی ”اللہ کرے امرتر نوکری مل جائے۔“

”لیکن دور ملے تو اچھا ہے“ فرحت نے کہا ”امرتر سے تو روزہ ہی آجائے گا۔ یہ نوکری مل بھی گی تو چلے گی نہیں۔“

ایلی نے امرتر جانے کی تجویز نہ سوچی تھی۔ اسے خیال نہ تھا کہ وہ امرتر جائے گا۔ اور نوکری کی بات تو ایلی نے ویسے ہی چلا دی تھی۔ ساری بات ہی عجیب تھی۔ اسے ابھی تک معلوم نہ تھا کہ امرتر جا کرے گا کیا۔ کہاں ٹھہرے گا۔ کہاں جائے گا۔ بات اس کے منہ سے یوں ہی نکل گئی تھی جیسے میز پر پاپتوں آپ ہی آپ چل جائے۔ اور حیرت کی بات تھی کہ اسے اس بات پر تعجب محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ آخر امر

ترکیوں۔ جانا ہی تھا تو لا ہور جاتا۔ لیکن لا ہور اب ایلی کے لئے خوش کن جگہ نہ رہی تھی۔ لا ہور سے بڑی خوشنگوار یادیں وابستہ تھیں جو اس کے لئے باعث تکلیف تھیں۔

امر تر پہنچ کر بھی اسے شعوری طور پر احساس نہ ہوا کہ وہ وہاں کیوں آیا ہے۔ بہر صورت وہ مطمئن انداز سے آوارہ گھومتا رہا۔ ہال بازار میں چار ایک چکر کاٹنے کے بعد وہ کمپنی باغ میں جا بیٹھا۔ دیر تک وہ بیٹھا لوگوں کو دیکھتا رہا پھر آموں والی کوٹھی کی طرف چلا گیا۔ آموں والی کوٹھی ویران پڑی تھی۔ دیواریں بوسیدہ ہو چکی تھیں دو ایک کروں کی چھتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ صحن میں گھاس پھوس انگلی ہوئی تھی۔

مرک کے کنارے وہ ایک نوئے ہوئے پل پر بیٹھ گیا۔ پرانی یادیں ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں تازہ ہو رہی تھیں۔

رسوی میں رسوئیہ اور چھوکرے چل پھر رہے تھے۔ رسوئیہ کھیر پکانے میں مصروف تھا۔ دودھ کی گاگریں قطار میں پڑی تھیں۔ سکھڑ کے کیس سکھار رہے تھے۔ بنگالی بابو پر غنڈٹ کے کمرے سے مچھلی تلنے کی بو آ رہی تھی۔ پھر دفترا آصف آگیا وہ اسے دیکھ کر مسکرانے لگا ”تم یہاں بیٹھے ہو“ وہ زیر لب گنگنایا ”نور آئے گا“ نور کا نام سنتے ہی گویا شبلگن سے بہار آ گئی۔ آموں پر بور آ گیا۔ کوئی کونے لگی۔ ایلی اٹھ بیٹھا۔

آصف جا چکا تھا۔ نور کا کچھ پتہ نہ تھا آموں والی کوٹھی پر وحشت بر س رہی تھی۔

گھبرا کر وہ چل پڑا۔

گھونتے گھونتے شام وقت وہ کشو ارنگیں میں جا پہنچا۔ بیٹھکوں میں بجلی کے ہندے جل رہے تھے جنگلوں میں زرق بر ق مبوات چمک رہے تھے روغنی چہروں پر

وہی مسکراہٹ وہی رنگ وہی دعوت۔ چوباروں میں سارنگیاں انتباہیں کر رہی تھیں۔ طبلے سر پیٹ رہے تھے۔ پان کی دوکانوں پر ویسے ہی جھر منٹ لگے ہوئے تھے لوگوں کی نگاہیں چوباروں پر جمی ہوئی تھیں۔

## شادی

دفعاً دھڑ رڑا زام \_\_\_\_\_ کی آواز سنائی دی۔ کثرا رکنیں میں سب لوگ چونکے۔ اس چوبارے کے ذینے سے جس کے نیچے ایں کھڑا تھا ایک بڑا سا گیند رہا ہلتا ہوا اسرا اور سڑک کے درمیان ڈھیر ہو گیا۔ پھر جو یہی نے غور سے دیکھا تو گیند گویا پھٹ گیا اور اس میں مٹا نہیں اور باراڑا نکل کر سڑک پر بکھر گئے۔

یہ دیکھ کر کثرا سے میں ایک قہقہہ لند ہوا۔  
”ہاہاہا \_\_\_\_\_“ ”بھی لوگ ہس رہے تھے کوئی امداد کے لئے آگے نہ ہڑھا۔

”ارے“ ایک بولا ”بھی اب کی بارتو بڑا اصر کیا سائیں نے۔ وہ بارہ کے بعد جوش آیا ہے۔“

”بیچارہ کیا رہا بھی نہیں جاتا بن دیکھے شادی کو۔“

”میاں عشق ہے جاک نہیں ہے۔“

”ہاں بھی عشق میں توہید یاں ٹوٹی ہیں سورتہوار ہاہے۔“

”اور وہ شادی اسے مالم ہی نہیں۔“

”کیسے ہو میاں اس کے دروچے پر تو لکھ پتیوں کی اے لمی کاریں کھڑی رہیں ہیں۔“

”کیا نام پایا ہے بھی اس شادی نے۔ ہر کوئی مرتا ہے اس پر کشوے کی رانی ہے رانی ابھی سمجھو کل ہی نتھ کھلوائی تھی اس نے اور آج۔“

شادی \_\_\_\_\_ ایلی کے ذہن میں ایک کرن سی چمکی \_\_\_\_\_ ”شادی \_\_\_\_\_ اس نے محسوس کیا جیسے وہ شادی کو جانتا ہو۔“

ایک اتنی بڑی نتھے والی مریل سی مگر او نجی لمبی زرد روٹر کی اس کے روپرو آکھڑی ہوئی ”سنجالوا پنی بنو کو۔“ وہ بولی اس نے تیم کی گٹھڑی اس کی طرف دھکیلی ریشمی ملبوسات کے اوپر ایک یہاں سے وہاں تک لمبی چوٹی لٹک رہی تھی۔

”سامیں،“ ایلی نے سامیں کی طرف دیکھتے ہوئے زیریں کہا اس نے محسوس کیا جیسے وہ خود بھی ایک سامیں ہو سامیں۔ اب بعد مشکل انپا آپ سمیٹ رہا تھا۔ اس کی ناک اور ناگ سے خون بہہ رہا تھا اس کی نکاہیں شادی کے چوبارے پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر وہ گھینتا ہوا شادی کے چوبارے کے زینے کی طرف بڑھا اور زینے کے ساتھ بازار میں تختے پر سر رکھ لے دیتے گیا۔ دفعتاً ایلی کو خیال آیا۔ کیا شادی عورت نہیں کیا وہ شخص طائفہ ہے کہ اسے سامیں کی حالت پر ترس نہیں آتا۔ کیا کثرے کی وہ تمام حسین و جمیل پتلیاں سب طوائف ہیں۔ ”نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ عورتیں ہیں ان سب میں کہیں نہ کہیں عورت چھپی بیٹھی ہے۔ وہ لاکھ پتی جن کی موڑیں چوبارے تلے کھڑی ہیں اور وہ تماشیں جو کہڑے میں آتے ہیں وہ تو طائفہ کے پاس آتے ہیں گھر کی عورتیں چھوڑ کر آتے ہیں۔ عورت سے فرار ہو کر آتے ہیں۔“ ہوں جبھی طائفہ عورت کو چھپا لیتی ہے اور طوائفہ کا روپ دھار لیتی ہے لیکن ان کی اپنی تسلیکیں تو اس چھپی ہوئی عورت میں مضر ہے۔

دفعتاً ایلی کے دل کمیں ایک شیدی خواہش پیدا ہوئی۔ کہ وہ جا کر شادی سے ملے اس سے پوچھئے کہ تمہاری عورت کہاں ہے اور تمہیں اپنی اصلیت کو تیا گئے میں کتنی تکلیف ہوتی ہے اور تم کتنی دلکھی ہو اور تمہاری زندگی اتنا بڑا الیہ ہے تو پھر تم طائفہ کیوں ہو۔؟“

اور اگر اس نے ایلی کو سامیں کی طرح میڑھیوں سے لڑکا دیا تو اگر وہ چھپی ہوئی عورت کو بیدار کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو اونھیوں نا یلی مسکرا دیا۔ اس

نے اگر اس کو چند اس اہمیت نہ دی جیسے یہ اگر بعید از قیاس ہو جیسے ایسا ہو ہی نہ سکتا ہو۔ میں کیا اس کا عاشق ہو جو مجھے بیٹھیوں سے لڑکادے گی لیکن شاید اتنے سارے لکھ پتی تماش بینوں کے روپ و وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو۔ انہوں بے کار ہے جنمگات میں ملاقات کیسی وہ چل پڑا۔

لیکن پنواؤڑی کی بات سن کر پھر رک گیا۔

”اے کہہ جو دیا آج شادی کی طبیعت اچھی نہیں جبھی تو دیکھ لو درواجے پر کوئی موڑ نہیں ورنہ شادی کا چوبارہ جو اور موڑوں سے خالی ہو۔ پنواؤڑی ہٹنے لگا اور پھر ایلی کی طرف متوجہ ہوا ربو لا۔“ اے بابو جی آگر جو کسی کو خل نہ آئے تو پھر دس سے کیا سلوخ کیا جائے۔“ ایلی مسکر اولیا۔

”اے سمجھا ریا ہوں کہ بھائی میرے دو رونج سے شادی کی طبیعت اچھی نہیں اس لئے یہ پانسو بچپن کے سگرت کے ڈبے آج نہیں بکھیں گے۔ ہی ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسا۔

”طبیعت خراب ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”یہ تو میں کہہ ریا تھا بابو جی۔“

”آجی نہیں بابو جی بڑی ضدوالی ہے طبیعت اچھی نہ ہو تو گاہک سے نہیں ملتی۔“ یہ سن کر ایلی کو سو جبھی پھروہ اس چوبارے کے سامنے کھڑا تھا۔ جہاں پہلے قیم اور نیم رہتی تھی۔ اور اب خالی پڑا تھا۔ ویرستک وہ اسے غور سے دیکھا رہا۔ پھر جو اس نے دیکھا تو اس کے سامنے ایک ہی چوبارہ تھا۔ سامنے الماس کھڑی نہس رہی تھی۔ ”آ جاؤ“ وہ بولی ”تم تو میرے ہم نام ہو الیاس اور الماس میں کیا فرق ہے۔ میں الماس ہوں بائی نہیں چند روز الماس بن کر جی لوں پھر تو“ وہ آہ پھر کر بولی ”بائی بن کر جانا ہی پڑے گا کیوں حصی،“ وہ آغا کے بھائی سے پوچھنے لگی ”جانا ہی پڑے گا۔“ میرے ایسے نصیب کہاں کہ ہمیشہ کے لئے الماس بن کر تیرے

قدموں میں پڑی رہوں۔“

دفعتا الماس کا چہرہ بدل گیا اور ایک اتنی بڑی نتھے والی لڑکی اس کی جگہ آکھڑی ہوئی اس نے آہ بھری۔

”شادی بن کر جینا میرے نصیب ہاں تم دیکھتے کیا ہو“ وہ بولی ”شادی گھر پر ہی ہے۔ باہم کی طبیعت اچھی نہیں۔“

پھر وہ شادی کے چوبارے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا جیسے واقعی شادی نے اسے بلا یا ہو۔ کمرے میں ایک موٹے سے میراثی کو دیکھ کر وہ گھبرا کر رک گیا۔

### پیغام بر

”گون ہے، میراثی تے فرعون بن کر پوچھا۔ ایلی چپکے دبکا کھڑا رہا۔ پھر میراثی اٹھ کر زینے کی طرف آیا۔“ گون ہے،“ وہ چلایا۔

”میں ہوں۔“

”میں کون؟“

ایلی خاموش رہا۔ میراثی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

ایلی کا جی چاہا کہ دوڑ کرو اپس زینے سے اتر جائے لیکن اب واپسی کی بھی ہمت نہ تھی۔

”مجھے، وہ بولا“ مجھے شادی کو پیغام میں پیغام لایا ہوں۔“

”گون ہے، اندر سے بڑھیا کی آواز آئی۔“

”لڑکا کہتا ہے پیغام لایا ہوں۔“ میراثی بولا۔

”کس کی طرف سے ہے۔“ بڑھیا بولی۔

”اے آنے دو۔“ ایک نوجون لڑکی کی آواز آئی۔

میراثی چل پڑا ایلی چپکے سے اس کے پیچے پیچے ہولیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میراثی رک گیا۔

شادی پنگ پر لیٹی ہوئی تھی ” ”آ جاؤ“ وہ تھکی ہوئی آواز میں بولی۔  
میراثی چلا گیا۔ ابھی ایلی بات کرنے کے لئے منہ سنوار رہا تھا کہ بڑھیا آگئی۔  
”کہاں سے آئے پو۔“ وہ تحکما نہ انداز میں بولی۔  
”ریاست سے آیا ہوں“ ایلی نے جواب دیا۔  
”ریاست سے“ بڑھیا چلائی۔  
ایلی نے سر بلاؤ دیا۔  
”کسی نے بھیجا ہے کیا؟“  
”ہاں۔“  
”کس نے؟“  
”پیغام لایا ہوں۔“  
”کس کا۔“

”اے بیٹھ کر ذرا دم تو لینے دو اسے“ شادی نے کہا ”تم جاؤ اماں۔“  
بڑھیا دو ایک ساعت کے لئے کھڑی رہی پھر میراثی نے بلانے پر چلی گئی۔  
”بیٹھ جا“ شادی نے کہا۔  
پانچتی کے قریب بڑے صوفے میں ایلی بیٹھ گیا۔  
اس کے روپرو ایک میار حسین عورت لیٹ ہوئی تھی۔ چہرے پر تھکاوٹ کے  
آثار تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ قمیض ڈھیلی تھی۔ آنکھیں خمار آلود تھیں۔  
”نہیں نہیں یہ وہ شادی نہیں۔“ ایلی نے سوچا ”وہ نتھ والی شادی چار سال میں  
وہ سے یہ ہو جائے۔“ نہیں نہیں یہ کوئی اور شادی ہے۔“  
”پیغام لائے ہو“ شادی نے ایلی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔  
”نہیں“ ایلی نے جواب دیا۔  
”نہیں۔“ شادی چونک کراٹھ پیٹھی۔

”اور تم تو کہتے تھے پیغام لایا ہوں۔“

”جھوٹ بول رہا تھا۔“

”ہائیں۔“ اس نے آنکھیں گھمائیں۔ ”سچ“

ایلی نے اثبات میں سر ہلا کر دیا۔

”جھوٹ کیوں بولتا۔“

”نه بولتا تو مجھے آنے نہ دیتے۔“

”کیا آنا اتنا یہ ضروری تھا۔“

”اس سے بھی زیادہ تو نہیں۔“

”اوہ \_\_\_\_\_ لچھا، وہ غریب تر ہو گئی۔“

ایلی نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر باہر کی طرف اشارہ کیا۔

## دو بچے

شاودی نے آنکھوں سے اثبات کا اظہار کیا۔ اس وقت بائی یوں مسکرا رہی تھی۔

جیسے دو بچے اکٹھے مل کر شرارت سوچ رہے ہوں۔

”چار سال پہلے،“ ایلی نے کہا ”تو مجھ سے ملتی تھی۔“

”سچ۔“

”ہاں اتنی بڑی نتھی تیرے ناک میں \_\_\_\_\_ دلتی پتی تھی تو۔“

”اوہ دلتی کیوں تھی۔“

”تو نے ایک ریشمی گٹھڑی مجھے دی تھی۔“

”گٹھڑی۔“

”ہاں۔“

”میں نے تو کبھی کپڑے نہیں بیچے۔“ وہ نہی۔

”گٹھڑی بزاری کی نہیں تھی۔ اس پر اتنی لمبی چوٹی تھی۔ اور تو نے وہ گٹھڑی میری

طرف دھکیلی تھی اور تیرے ساتھ بہت سی لڑکیاں بھی تھیں۔ اس چوبارے کی پچلی منزل میں چاروں طرف والان تھے اور صحن کے درمیان ہیری سائکل تھی۔“

”ہائے اللہ“ وہ چونکی ”اچھا وہ تسلیم کے گھر مجھے یاد آیا۔“

”تم وہی شادی ہو کیا۔“

”ہاں۔“

”جھوٹا۔“

”کیوں۔“

”نہیں۔ کہاں وہ زروروی لڑکی اور کہاں تم۔“ ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیوں کیا ہے مجھے۔“ وہ تحریر سے بولی۔

”پتہ نہیں“ ایلی نے کہا۔ ”لیکن کہوئے میں لوگ کہہ رہے تھے سارا شہر پا گل ہو رہا ہے۔ تھمارے پیچھے۔

”ہونہہ“ اس نے ہونٹ بٹوہ بنائے۔ ”سب اپنے مطلب کے سیانے ہیں کوئی بھی پا گل نہیں ہوتا۔“

”یہی دیکھنے تو میں آیا تھا۔ میں نے کہا میں بھی ایک نظر دیکھ آؤں۔“

”تو پھر کیا دیکھا۔“

ایلی نے اشبات میں اشارہ کیا۔ ”سب کچھ دیکھا۔“

شادی نے جنون سے اپوچھا ”کیا۔“

”پا گل ہو جاتا ہے۔“

”کون۔“

”دیکھنے والا۔“

”وہ بُل سی۔“ ”جھوٹ! کوئی نہیں ہوتا۔“

”جو بائی کے پاس آتے۔ جو شادی کے پاس آتے ہیں وہ ہو جاتے ہیں۔“

”تم ہو گئے ہو۔“ وہ بُنی۔

”ہو گیا ہوں۔“ اس نے سمجھدگی سے کہا۔ اور پھر انٹھ بیٹھا۔

”بُنی ہو۔“ وہ بولی۔

ایلی نے لنگی میں سر ہلا دیا۔

”کیوں۔“

”زیارہ پا گل ہونے کافی کہہ؟“

وہ بُنی۔ ”تمہاری باتیں اشی ہیں۔“

”امی نہیں سچی ہیں۔“

”کیسے؟“

”تم کون سچی باتیں کرتا ہے یہاں کوئی نہیں۔“

”یہ سچ ہے۔“ وہ بولی۔

”سبھی سچ تھیں۔“

”اے ہے میں نے تمہاری تو اضع نہیں کی۔“

”لووہ بولا۔“ شادی سے ملا دیا اس سے بڑھ کر اور کیا تو اضع ہو سکتی ہے۔“

وہ چل پڑا۔ اچھل کر شادی نے سلیپر پہن لئے اور ساتھ چل پڑی۔

”تیرانام کیا ہے؟“

”ایلی۔“

وہ بُنی۔ ”کیا نام ہے۔ کوئی سمجھے تیلی ہو،“

”ٹھیک سمجھے۔“ وہ بولا ”میں تیلی ہوں تو عطر ہے۔“

شادی نے گویا اس کی بات نہ سنی۔

”پھر آؤ گے۔“ اس نے پوچھا۔

”کون آنے دے گا۔“

”ریاست کے مہاراجہ کا پیغام لے آنا۔“ وہ بُل سی۔

”اچھا مہارانی۔“ ایلی نے جھک کر سلام کیا۔

جب وہ نیچے کشوے میں اترات تو لوگ اپر کی طرف دیکھ رہے تھے اس نے اپر دیکھا جنگل میں شادی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ دلیزیر پر سائین کے کھلے ہونٹوں سے

لعلہ پک رہا تھا۔

تاریک عزم

کشوہ رنگیں میں سے گزرتے ہوئے ایلی غور لئے ہر بائی کی طرف دیکھ رہا تھا جو چوبارے کے جنگلوں، چھت کی سشتوں، اور جدید طرز کے مکانات کی بالکوںیوں میں پیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے بنے سورخ و خال اور سنگار کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہر بائی میں اسے شادی و کھانی دے رہی تھی۔ وہ بیوی چھپی ہوئی عورت محروم دکھائی دیتی ہے اسی قدر پر بیشان حال ہوتی ہے وہ سوچ رہا تھا۔

کشوے سے نکل کر دفتا اسے خیال آیا اب مجھے کیا کرنا ہے۔ وہ چونک پڑا۔ سوچنے لگا۔ آنحو میں یہاں آیا ہی کیوں تھا۔ ویسے ہی سیر کے لئے۔ کیا شادی سے ملنے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے تو شادی کا علم بھی نہ تھا پھر اسے کوئی جواب نہ سوچا۔ اس نے اپنا قدم اور تیز کر دیا۔

”ارے رے رے۔“ ایک راہ گیر اس کی طرف جبھٹا اس نے ایلی کو بازوؤں میں تھام لیا۔ ”ارے بابو کیا بدرو میں گرو گے۔“

اس وقت وہ بدرو کے عین کنارے پر کھڑا تھا۔

”بدرو میں گرو گے! بدرو میں گرو گے!!“ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

”غلاظت میں لٹ پٹ ہونے کا شعق ہے کیا۔“ کوئی نہ سا۔

”کنونیں میں گرو گے۔“ کوئی چلائی۔

”آ جاؤ آ جاؤ۔ میں یہاں ہوں۔“ آرام باغ کے ایک چوبارے سے ایک بد شکل کسی نے کھڑکی سے سر نکال کر اسے آواز دی۔

”ہی ہی ہی۔“ چیپٹ کے داغوں بھر ہوں سے پھولا ہوا چہرہ اس کے روپ پر آ گیا۔ ”یہ کیا لت پت ہوگا؟ لت پت ہونا تو مردوں کا کام ہے۔“

”بند کمرے کی بات بھول گیا۔“ ایک بڑھیا لامبی شیقی ہوئی آ گئی۔

”آ جاؤ آ جاؤ۔ اس کی بات نہ سنو۔“ ایک نے کہا۔

چاروں طرف سے آوازیں آ رہی تھیں آرام باغ کے چوباروں میں بیٹھی ہر کسی اسکی طرف دیکھ کر مسکر لیتھی۔ وہ رک گیا۔ اور مردانہ شان سے دائبٹ بیٹھ کر بولا۔

”ہاں میں لت پت ہوں گا۔ کیوں میری مرضی \_\_\_\_\_ مجھے کون روک سکتا ہے۔ اگر پا گیزگی کی طرف جانے کے لئے روکا ٹھیں کھڑی کر دی گئی ہیں تو میں کنونیں میں کو دوں گا۔ لت پت ہوں گا۔ لت پت ہوں گا۔ لت پت ہوں گا۔“ وہ اعلانیہ کسبیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا کہا بابو؟“ ایک مزدور رک گیا ”کیا ہو گے تم۔“

”میں،“ ایلی چونکا۔

”کہہ جو رہے ہو کچھ“ مزدور بولا۔ ”میں سمجھا شاید مجھے سے کہہ رہے تھے۔“ ”تم سے نہیں کہہ رہا“ ایلی نے جواب دیا۔ اور وہ دونوں کھڑے ہو کر سامنے کی کھڑکی میں کھڑی پٹھانی کی طرف دیکھنے لگے۔

”دیکھ بابو،“ مزدور قریب تر ہو گیا۔ یہ جو پٹھانی ہے نا یہ سامنے چوبارے والی ہے تو پٹا خود طریقے آتے ہیں کہ بس سمجھ لو ۲ نکھیں روشن ہو جائیں پر اسے بیکاری ہے۔

”بیماری۔“ ایلی نے حیرت سے دہرا�ا۔

مزدور نے آنکھ ماری۔ ”وہی بیماری۔“ وہ بولا ”جو ہوا کرتی ہے۔“

کچھ دیر تو ایلی گھور گھور کر اعلانیہ کسپیوں کو جانچتا رہا پھر فقط اسے شرم محسوس ہونے لگی۔

کسپیوں کی باتیں بھدی اور نگلی تھیں اور وہ محسوس کر رہا تھا جیسے چوکیوں پر خالی جسم کے ڈھیر لگتے تھے پلپلاتے جسم جو نہیں۔ بڑی بری جو نہیں۔ اس کا وہ مردانہ عزم ختم ہو گیا نہ کہ جھک گئیں ول دھک دھک کرنے لگا پھر جو اس نے دیکھا تو وہ آرام باغ سے وہ رنگل آیا تھا۔

پھر فدا ایک عظیم شورستائی دی۔ اور رودور پیچھے بہت پیچے وہ چیخ رہی تھیں چلا رہی تھیں۔

”ویکھانا بھاگ گیا۔“

”ہاتھ پلے کچھ ہوتا تو \_\_\_\_\_ !!“

”یہ مرد کا کام ہے \_\_\_\_\_ !!!“

”ہند کمرے ہی میں جائے گا \_\_\_\_\_ !!!“

گھبرا کر ایلی پل پر بیٹھ گیا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ ہر کوئی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ہم جانتے ہیں کیسی مسکراہٹ کوئی بات نہیں کیسی نہیں۔ بیچارا کہتی ہوئی نہ گا ہیں۔ اس نے محسوس کیا جیسے آرام باغ والیوں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہو سب کچھ۔

## مظلوم جبشی

کئی ایک بار وہ آرام باغ میں ادھر سے ادھر تک اور ادھر سے ادھر تک آیا گیا۔ کئی مرتبہ اس نے شدید کوشش کی کہ کسی چوبارے کے زینے پر چڑھ جائے لیکن عین قریب پہنچ کر نہ جانے کیا ہو جاتا۔ وہ محسوس کرتا جیسے سمجھی اس کی طرف دیکھ رہے

ہوں۔ دوکان دار را گیر تماش بین اور کیسیاں۔ یہ محسوس کر کے وہ گھبر جاتا اور آگے چلانا شروع کر دیا۔

اس نے کئی مرتبہ ان میں سے ایک کاشناو کیا۔ کئی مرتبہ ”اچھا یہ ٹھیک ہے یہ والی واپسی آؤں گا تو سیدھا اور پر جب نہ جاؤں گا“ لیکن جب وہ واپس آتا تو وقت پر زینہ پچان نہ پاتا اور پھر اسے نکل جاتا اور پھر جب وہ آگے نکل جاتا تو اسے خیال آتا دھمیں یہ تو اچھی نہیں۔ اس کی نگاہیں تو بے باک ہیں، نگل نگاہیں، دیکھو تو کیسے چھاتیاں ہلا کر آگے کو بڑھاتی ہیں۔ لا حول ولا قوۃ۔

ایلی تھک کر چور ہو گیا۔ لیکن ابھی تک وہ آرام باغ میں گھوم رہا تھا۔ دوکان میں بند ہو چکی تھیں۔ پنواڑیوں کے گروہوں کے لئے ہمارا باتھا لوگ اور پردیکھر ہے تھے اشارے کر رہے تھے انگلیوں سے دام چکار ہے تھے کیسیاں مسکرا رہی تھیں با آواز بلند گالیاں دے رہی تھیں۔ نیکے نیکے اشارات کر رہی تھیں۔

ایلی کے دل میں نفرت کا ایک طوفان پیدا ہو چکا تھا۔ ساڑھارہ نج چکے تھے کسی چوبارے پر چڑھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چونکہ پنواڑی کی دوکان پر کھڑے تماش بینوں سے آنکھ بچا کر اور پر چڑھنا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ سب ایک دوسرے پر آوازے کس رہے تھے پہتیاں اڑا رہے تھے۔ اس کے پاؤ جو دا ایلی وہیں ایک تاریک کونے میں کھڑا تھا۔ وہ اس گھات میں تھا کہ کب کوئی دروازہ و کھائی دے جو لوگوں کی نگاہوں سے دور ہو اوث میں ہو اور وہ آنکھیں بند کر کے کانوں میں انگلیاں ٹھوٹس کر سیڑھیاں چڑھ جائے اس کا عزم اور بھی مضبوط ہوا جا رہا تھا۔ اس عزم کی وجہ حصول لذت اور عیش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت ایلی خوف اور نفرت سے کئی بار جھر جھری لی تھی اور اب وہ نفرت اس قدر شدید ہو چکی تھی کہ اسے کوڑے مار رہی تھی۔ اور مظلوم جبشی کی طرح کوڑے کھا کھا کروہ خود کو مشتعل کئے جا رہا تھا۔

وہ کسیاں درحقیقت اس وقت ایلی کی نگاہ میں وہ رندیاں نہ تھیں بلکہ اس ہائی کورٹ کی بحث تھیں جہاں وہ آخری اپیل پیش کرنے جا رہا تھا۔

”مجھ میں لت پت ہونے کی ہمت ہے۔“

اس وقت وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں نے داروں پر کمگی ہو۔ اس کا سر گوم رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں ستارے گلزار ہے تھے غلیظ جسموں سے گندگی کی بوچھاڑیں اڑ رہی تھیں لکھے ہوئے سر۔ ذہیر ہونے جا رہے تھے۔ خون بہتا ہوا خون۔ بازو اٹھنے ہونے تھے۔ ہاتھ شول رہے تھے۔ ہاتھیوں کی سوندیں اس کی طرف بڑھ رہی تھیں تاکہ اسے گرفت میں نہ لے لیں۔

پھر دنلا آیک چینی سنائی دی کی کئے ہوئے دھڑکی چین۔ تمام فضاسارخ ہو گئی۔ وہ کونے سے یوں باہر نکل آیا جیسے اسے کوئی بھی نہ دیکھ رہا ہو۔ جیسے کسی کے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

زینہ چڑھتے ہوئے اس نے نیچے شوروٹ کی آواز سنی وہ رک گیا اور اس نے دونوں ہاتھا پر اٹھائے اور نعرہ گلایا ”لت پت زندہ باد۔“

ایلی کی نگاہ اوپر کی طرف اٹھی اور دروازے پر بحدا بد نما چہرہ اس کی طرف گھور رہا تھا چاروں طرف سے چیپک کے داغوں کی بوچھاڑ پڑ رہی تھی۔

پھر وہ بد نما بحدا بد نما چہرہ پھیلنے لگا۔ گویا چیپک کے داغوں کا بھرا تھا لکسی نے اندر میل دیا ہو پسینے اور گوشت کی مکروہ بو۔ سرکٹ کرنے جانے کہاں گر گیا لاش۔ ٹھنڈے گوشت کی عظیم بد نما لاش۔

مظلوم جبشی نے کوڑوں کی ایک بوچھاڑ محسوس کی \_\_\_\_\_ بو کا ایک ریلا آیا۔ جوش اور غصے میں اس نے آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دی۔ قحفن کی وجہ سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ چھینٹے اڑ رہے تھے۔ اور پھر ایک ہوائی \_\_\_\_\_

اور پھر وہ نگلے فقیر کی طرح چپڑ میں لٹ پت تھا۔ شرم سے اس کی گردن لٹک گئی تھی۔ اسے اپنے آپ سے گھن آ رہی تھی۔

گوشت کا بدنما سمندر پٹ رہا تھا۔ ایک کریہہ مظہر چہرہ ابھر رہا تھا۔ بدنما دانت رینگاتی ہوئی منحوں آنکھیں۔ پھر کوئی اسے تسلی دے رہا تھا۔ اپنا گھر ہوا پنی عورت ہو۔ اپنی بوتل ہوا پنا گلاں ہو۔ یہ چیز چسکیاں بھرنے کی ہے۔ غٹاٹ کی نہیں۔

”یہ محبت کا کھیل ہے۔ سوہنے کا نہیں۔ محبت کا۔“

”پہلے پہل ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

”پہلے پہل لاٹھی مارنے کا شوق ہوتا ہے۔ لاٹھی تو ٹیک کر دھری جاتی ہے۔“

ایسی کو اپنے آپ سے بو آ رہی تھی۔ اس کرے سے وحشت ہو رہی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ سراٹھا کر دیکھتا کہ کون اسے تسلیاں دے رہا ہے۔ اس کی باقی میں سننے کی اسے فرصت نہ تھی۔ چسکیاں بھرنا۔ ٹیک کر چلانا یہ سب اس کے لئے بے معنی تھا۔ ایسی یوں محسوس کر رہا تھا جیسے گندم کا دانہ کھانے کے بعد وہ ننگا ہو۔ احساس گناہ اور احساس پستی چاروں طرف سے یورش کر رہے تھے۔

### اپنی بوتل اپنا جام

پھر وہ نیشن کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ڈیڑھ بجے جانے والی گاڑی کو پکڑنے کے لئے بے تاب تھا۔

گاڑی میں لاٹھیں پڑی تھیں۔ ان کے اوپر چادریں پڑی تھیں۔ مگر نیچے وہ سب نگلی تھیں بڑے بڑے ڈھکے ہوئے تھال جن میں سے چیپک کے داغ نکل کر چاروں طرف ڈھیر ہونے کے لئے بے تاب تھے۔ وہ لیٹ گیا۔ یوں لیٹ گیا جیسے خود ایک لاٹھ ہو کئے ہوئے سر کی لاٹ تھفن اور بدبو سے بھری گلی سڑی لاٹ۔

جب وہ محلے میں پہنچا تو تمیں بجے تھے۔ فرحت کی ڈیورٹھی بندھی۔ وہ وہاں بیٹھا گیا۔ تھک کر بیٹھ گیا۔

شاید شہزاد کا دروازہ کھلا ہو۔ اسے دو ایک مرتبہ خیال آیا۔ لیکن وہ شہزاد کی طرف جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس سے بوآرہی ہے اور وہ اب اس قابل نہیں کہ شہزاد کی طرف جائے۔ ایک کراہتے ہوئے مظلوم جبشی کا قسر شاہی میں ملکہ کے روپ و جانے کیا مطلب۔

دیر تک وہ وہاں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سوچا۔ دیکھوں تو تھی۔ چاہے اندرون جاؤں۔ پر دیکھوں تو تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ شہزاد کا دروازہ بند تھا۔ اس نے انتہی سے اسے ہر زماں یا شاید کھل جائے۔ ”گون ہے۔“ اندرون سے رابعہ کی آواز آئی۔ وہ خاموش رہا۔

”گون۔“ رابعہ کی آواز آئی۔ وہ خاموش رہا۔

”گون۔“ رابعہ پھر چلائی۔

”میں ہوں ایلی۔“

”تو ہے ایلی۔“ وہ بولی ”مظہر ذرا۔“

دروازہ کھل گیا۔ وہ چپکے سے اوپر چڑھ گیا چوبارے کے سامنے صحن میں صرف دو چار پائیں پچھی ہوئی تھیں۔ ایک پر بچیاں پڑی تھیں دوسری پر شہزادی۔ وہ بے خبر سورہی تھی۔ ایلی نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن بیگم کی چار پائیں کہیں دکھائی نہ دی۔ پھر وہ چوبارے کے اندر گیا دوسرے چوبارے میں۔ اور بالآخر چھپت پر چڑھ گیا لیکن بیگم کا کہیں نشان نہ تھا۔

والپس آکر وہ شہزاد کے قریب کھڑا ہو گیا۔ وہ یوں پڑی تھی جیسے جھوٹ موت آنکھیں مومن رکھی ہوں اور ویسے جاگتی ہو۔ اس کی پیشانی کا تل چمک رہا تھا۔ بازو چھاتی پر رکھے ہوئے تھے۔ قمیض کے بیٹھن کھلے تھے کتنا روشن جسم تھا۔ جیسے پھولوں

سے بنتا ہو۔ عجیب سی باس آ رہی تھی۔

”یہ تو محبت کا کھیل ہے“ کوئی آہستہ سے بولی۔

”اپنی بوتل ہوا پنا گلاس ہو۔“

شہزاد کا جسم یوں دکھانی دئے رہا تھا جیسے بوتل ہو۔

جام بھرنے کے لئے بوتل اٹھی ہوئی تھی۔

”غُٹ غُٹ نہیں۔“ کسی نے اس کے کان میں کہا ”یہ تو چکنیاں لینے کی چیز ہے۔“

شہزاد نے کروٹ لی اور رہا تھی سے اٹھانے لئے

ایلی کی نگاہ کھلے ٹھوں پر پڑی جیزت اور خوشی سے اس کی آنکھیں کھلی کھلی رہ گئیں۔

ایلی بھول گیا کاس سے تعفن بھری یو آتی تھی۔ وہ بھول گیا کہ اس کے جسم سے چیپک کے داغ ابھی تک چمٹے ہوئے تھے۔ وہ قریب تر ہو کر بیٹھ گیا۔

”اونھوں“ کسی نے اس کے کان میں کہا ”لاٹھی تو نیک کر کھنے کے لئے ہوتی ہے۔“

ایلی نے آنکھیں بند کر لیں اور نیک کر لائی رکھنے لگا قریب اور قریب اور قریب خوبصورت ایک ریلا آیا۔ نرم زرم لمس ایک جھر جھری۔ بازو اٹھے اور اس کے گردھائل ہو گئے۔

## بلغ علم

اگلی روز ابھی وہ سویا ہوا تھا کہ علی احمد کا خط موصول ہوا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ چونکہ ملازمت ملنا مشکل ہو رہا ہے۔ اور گورنمنٹ نے آدمی بھرتی کرنے کی وجای تخفیف کی اسکیم میں بنارہی ہے۔ لہذا ایلی کو چاہیے کہ وقت ضائع نہ کرے اور سنترل ٹریننگ کالج میں داخل ہی لینے کی کوشش کرے تاکہ اسے ٹینکنیکل تعلیم حاصل ہو

جائے اور ملازمت ملنے میں آسانیاں پیدا ہوں۔

شینوگرافی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایلی کے دل میں بڑی امیدیں تھیں۔ اس زمانے میں شینوگرافر بہت کم یا ب تھے اور پھر بی اے شینوگرافر کا مانا تو قطعی طور پر مشکل تھا۔ ایلی کا خیال تھا کہ اسے ملازمت مل جائے کی۔

ایلی نے کئی ایک محالموں میں درخواستیں دے رکھی تھیں۔ دو ایک جگہ سے اسے اٹرو یو کا خط بھی آیا تھا مگر یہ خط اسے اٹرو یو کے دن کے بعد موصول ہوئے تھے ظاہر تھا کہ ففتر والوں نے اسے محروم رکھنے لیتے وہ خط دیری سے حوالہ ڈاک کئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمان تھا اور فتر والوں پر ہندوؤں کا راج تھا۔ یا شاید فتر والے اپنے آدمیوں کے لئے موافق پیدا کرنا چاہتے تھے ایک جگہ وہ وقت پر اٹرو یو میں پہنچ گیا تھا لیکن جب کاسب اسپکٹر انہیں ڈیکٹیشن دے رہا تھا تو ایلی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس زبان میں یوں رہا ہے اس کی زبان انگریزی۔ پشتہ اور پنجابی کا مرکب معلوم ہو رہی تھی۔ لہذا اس نے کورا پر چڑھ دیا تھا اور پھر خود ایک ٹین کے سینماوس میں جا کر تماشہ دیکھنے لگا۔ محلہ دیل کے ایک اٹرو یو میں اسے ایک لڑکی سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔

یہ بڑے صاحب کی آرام کری کے ایک بازو پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور بڑا صاحب نہ کر ایلی سے پوچھ رہا تھا۔ ”تم اس سے مقابلہ کر سکو گے۔“ ایلی نے جواب دیا تھا صاحب خطوط کی گولائیوں میں تو نہیں البتہ سپیڈ میں کوشش کروں گا اور بڑے صاحب نے قہقہہ لگا کر لڑکی سے کہا تھا۔ ”ناتم نے کیا کہہ رہا ہے یہ۔“ اور وہ مسکرا دی تھی اور پھر اس نے ایلی پر ایک پیار بھری نگاہ ڈالی تھی ایسی نگاہ کہ ایلی کا دل چاہا کہ وہ ہاتھ جوڑ کر صاحب سے کہہ دے ”حضور میں چاہتا ہوں کہ مجھے اس مقابلے میں امیدوار تصور نہ کیا جائے۔“ اس کا نام روزی تھا۔ اور اس کے کپڑوں سے دہائیت روز کی خوبیوں آ رہی تھی۔ پھر صاحب قہقہہ مار کر نہیں تھے۔ ہمیں تم پسند

آئے ہو کیا نام ہے تمہارا۔ اگر اب کوئی جگہ خالی ہوئی تو ہم تمہیں بلا لیں گے۔ اپنا پتہ دفتر میں چھوڑ جانا۔ ”پھر وہ روزی سے کہہ رہے تھے ”مس روزی اب اس سے ہاتھ تو ماللو۔“ اور ایلی یوں باہر لکھا تھا۔ جیسے اسے نوکری کے لئے چن لیا گیا ہو۔ اس روز وہ اتنا خوش تھا کہ غم غلط کرنے کے لئے اس بیٹن کے سینما ہاؤس میں جانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔

اتنی بار کوشش کے باوجود وہ کامیاب نہ ہوا تھا۔ اب تو ایلی واقعی ما یوں ہوا جا رہا تھا۔ اگر چہ نوکری پر جانے کی اس میں قطعی طور پر کوئی خواہش نہ تھی یا ان اسرار سادی ہوتی rights reserved 2002-2006 alger abu alkarim الگر ابوالکارم کرتے اگر منصر سے

تعلق قائم رہتا تو خصوصاً جب اسے آپی بول اور اپنے جام سے واقفیت ہو چکی تھی۔ جب وہ چسکیاں لینا سیکھ رہا تھا۔ جب وہ لٹھی لیک کر چلنے سے واقف ہو رہا تھا۔ اب نوکری کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن اماں اور بہن شدت سے مصر تھیں کہ وہ داخلہ لے لے۔ او شہزادہ نہس کر کہہ رہی تھی۔ ”دو گھنٹے کا تو فاصلہ ہے۔ صرف دو گھنٹے کا خواہ مخواہ کیوں رومنی شکل بنارکھی ہے تم نہ آسو گے تو میں جو ہوں۔ میرے پاؤں میں مہندی لگی ہے کیا۔ اب تو ہاتھوں کی بھی اڑگئی۔ جب تجھے ہی اچھے نہیں لگتے تو پھر کیوں رنگوں میں اپنے ہاتھ۔“

”سنٹرل ٹریننگ کالج میں جب وہ ایڈمشن یورڈ کے سامنے پیش ہوا تو اس کے کو اکٹ پڑھ کر سب ہنسنے لگے۔“

”ہاں تو آپ کا نام الیاس آصفی ہے۔“

”جی۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”اور کیا ہم جاسکتے ہیں کہ آپ یہاں کیوں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔“

”میں استاد بننا چاہتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”اکر کیوں۔“

”یہ ایک نوبل پروفیشن ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”یہ آپ کب جانا کہ ٹھیک نوبل پروفیشن ہے۔“

”جی۔ جی۔“ وہ لگ گیا۔ یہ تو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ ویر

سے میرا مطلب ہے میرے تمام بزرگ درس و مدرسیں میں

”استاد بخنے کی خواہش کب سے آپ نے محسوس کی؟“ ایک اور صاحب نے  
وضاحت کی۔

”یہ تو میری پرانی خواہش ہے۔“ ایلی نے ہذا۔

”تو پھر آپ نے پچھلے سال سینئر فرانی کیوں سکھی؟“

”جی۔ جی۔ میرا مطلب ہے۔“ ایلی کھیلانہ ہو کر رہ گیا۔

”نو جوان۔“ ایک اور صاحب بولے ”آپ سینو گرافر ہیں لی۔ اے ہیں آپ  
کو معقول تو کریں سکتی ہے لہذا یہاں داخلہ لینا بے کار ہے۔“

ایک اور صاحب بولے۔ ایسے کیسز پر گور کرنا سر اسر غلطی ہو گی اس نو جوان نے  
بے۔ اے اکنامکس اور فلسفہ میں کیا کیا ہے اور یہ دونوں مضامین سکول کے مضامین  
نہیں یہاں ڈرینگ میں آپ کون سے مضامین لیں گے۔“ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر  
بولा۔

”جی میں سائنس لے سکتا ہوں میں نے دویں سائنس ڈرائینگ میں پاس کی  
تحی۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”جنظامیں،“ کونے میں بیٹھا ہوا انگریز پروفیسر بولا۔ ”تمہارا سائنس کا مبلغ  
علم۔“ اس نے چلکی بھری اور کہا۔ ”سمجھ لو اس سے بھی کم ہے۔“

ایلی کو علم نہ تھا کہ وہ آرام سڑاگ تھا اور سائنسی تحقیق میں بین الاقوامی حیثیت  
رکھتا تھا۔

”حضور۔“ ایلی چلایا ”میرے والد اور واداع مر بھر پڑھانے کا کام  
”پڑھانام تھا نہ ہے۔“ بورڈ کے صدر نے کہا ”تمہارے والد نے نہیں۔“

ایلی کچھ کہنے کے لیے سوچ رہا تھا کہ صدر بولا۔ ”یومے گونکش دن۔“

## بیٹن لشت

تمام امیدواروں کو کالج کے ہوٹل میں رہنے کی اجازت تھی۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ اس روز ہوٹل میں شور مچا ہوا تھا۔ بہت سے امیدوار ہمیں داخل کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ اپنا سامان باندھنے میں معروف تھے ایلی بھی اپنا بستر باندھ رہا تھا کہ اُر میزیری کا نوکر کام ادا ہو رہے گزر۔

”ارے گامے۔“ وہ چلایا ”یا رآخری مرتبہ کی چائے تو پلا دے۔ مژا نگ ہو۔“

ایلی کے انداز گفتگو میں صاحبیت کا غصہ نہ تھا۔ عام طور پر امیدواروں کو یوں سے یوں بات کیا کرتے جیسے کوئی ورک کالا میں سے بات کر رہا ہو۔ وہ سب بے۔ اے آئم۔ اے اور چونکہ نئے تھے۔ لہذا انہیں اپنی عظمت کا شدت سے احساس تھا۔ ایلی میں نہ جانے کیوں یہ بات کبھی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ اس لئے نوکریا ایسے ہی دوسرے ان پڑھ لوگ عام طور پر ایلی سے خوش رہا کرتے تھے۔

”آخری مرتبہ کیوں بابو جی۔“ گمانے پوچھا۔

”ارے یار گامے ہمیں تو چھٹی مل گئی۔“

”نہ بابو جی مجاک نہ کرو۔“ وہ بولا۔

”ارے ٹھیک کہہ رہا ہوں ہیوقوف اپنا تو پتہ کٹ گیا۔“ ایلی چلایا۔

”میں نے کہلا بابو جی۔“ وہ جھگختے ہوئے بولا۔

”کیا ہے؟“

”جو میں ایسی ترکیب لڑاؤں کے بات بن جائے تو۔“

”ہیوقوف،“ ایلی ہمسا۔ اسے ہمارے والد صاحب نے چار سفارشیں پہنچائیں

تحمیں ایک نہیں پوری چار سب بے کا گئیں تو کیسی ترکیب لڑائے گا۔“

”اگر جو میری بات مانو تو سمجھ لو بات پکی ہے۔“ گامے نے دانت نکالے۔

”کیا؟“ ایلی نہسا۔

”بس یہاں سے جاؤ نہیں بیٹھے رہو۔ انہم سے بیٹھے رہو با بوجی سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”یعنی خواہ مخواہ بیٹھا رہوں۔ لوگ کیا ہیں گے۔“

”کوئی کچھ نہیں ہے گا۔ کسی کو معلوم ہی نہ ہوگا۔“ گامے نہ کھا۔

”اور اگر پر نہ نہ کرنے پوچھا۔“

”تو کہنے بیٹھن لشٹ پہ ہوں۔ ل۔“

”بیٹھن لشٹ؟“ ایلی نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ کیا کہتے ہیں اسے جن کا پسلہ ابھی نہیں ہوا۔“ گامے نے وضاحت کی۔

”اچھا۔“ ایلی نہسا۔ ”وینگ لشٹ۔“

”جی۔“ گامہ دانت نکالے۔ ”بات پکی سمجھو با بوجی سمجھو پر ایں کرو۔“

”کتنے دن رہنا پڑے گا یہاں۔“

”بس یہی آٹھ روچ۔“

اس روز تو ایلی رک گیا لیکن اگلے روز اسے خیال آیا کہ ایک جاہل نوکر کی بات یوں اس جگہ آٹھ روچ پرے رہنا انہوں۔ اس نے پھر سامان باندھنا شروع کر دیا۔ لیکن گامے کے اصرار پر پھر رک گیا۔ پھر اسے خیال آیا چلو جانے کی جلدی کیا ہے۔  
بیٹھن لشٹ نہ کہی آٹھ روچ سینما ہی دیکھو۔

روز بآ قاعدہ وہ کالج میں جاتا۔ بیٹھی کی کلاس میں تو بہت کم لڑکے تھے لیکن ایس۔ اے وہ۔ میں گویا گھمسان کا رن پڑا رہتا تھا۔ اس لئے وہ ایس اے وی میں جا گھستا۔ اور پچھلی سیٹوں پر بیٹھ کر شریر لڑکوں کے ساتھ نیچ بجا تا بوٹ

زمین پر گھساتا۔ اور منہ بند کر کے گلے سے شیشی کی آوازیں پیدا کرتا۔

وہاں اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ کلاس میں گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ گھبراہٹ جو بی۔ اے تک وہ محسوس کرتا رہا تھا۔ وہ پرانا احساس کمتری شدت کھو بیٹھا تھا۔ یا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بیٹھن لشٹ پر ہونے کی وجہ سے وہ اسے محض تفریح سمجھ رہا تھا۔

کلاس میں جب ہنگامہ ہوتا تو پروفیسر غصے میں آ کر حاضری کا رجسٹر منگوالیتا اور پھر ان لڑکوں سے پوچھتا جان کے نام رجسٹر میں درج نہیں تھے کہ وہ جماعت میں کیوں بیٹھے ہیں۔ اس پر بازاری باری لڑکے اٹھ گرا پیشان نزول کی وجہ تسمیہ بتاتے۔

”صاحب میرے کیس کا ابھی نیچلے نہیں ہوا۔“  
”میرا کیس بھی زیر غور ہے۔“

”جی میرا نام تو چنانجا چکا ہے ابھی رجسٹر میں اندرانج نہیں ہوا۔“

پہلی مرتبہ جب ایلی سے پوچھا گیا اس نے جواب میں کہا۔ ”جناب میں بیٹھن لشٹ پر ہوں۔“

”بیٹھن لشٹ۔“ پروفیسر نے دہرایا لڑکوں نے قہقہہ لڑ لگایا۔

”تمہیں کس نے بیایا کہ تم وینگ لشٹ پر ہو۔“ پروفیسر نے پوچھا۔

”جناب مجھے گامے نے بتایا ہے۔“ ایلی نے سمجھ دی۔

”گاما۔“ پروفیسر بھگت سنگھ گھبرا گیا۔ ”گاما کون۔“

”ہمارا بورچی۔“

اس پر جماعت کے لڑکے قہقہہ مار کر ہنسنے۔ ڈسکیں بخت لگیں۔ سیٹیوں کی آوازیں بلند ہوئیں اور پروفیسر بھگت سنگھ غصے سے احتجا جا کرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد سبھی شور مچا رہے تھے۔ ”اے وہ بیٹھن لشٹ کونسا ہے۔“ وہ سب محبت اور احترام بھری نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور ایلی نے پہلی مرتبہ

محسوس کیا کہ کلاس میں نگاہوں کا مرکز بننے میں کتنی لذت ہے۔

لیکن یہ سب کچھ محض تصنیع تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ایلی کا وہ جواب انٹھ گیا تھا لیکن بنیادی طور پر وہ ابھی تک وہی ایلی تھا۔ احساس مکتری کا مارا ہوا ڈر اور خوف کے جذبات کا شکار ایلی۔

انٹھ روز کے بعد کانچ پندرہ دن کے لئے بند ہو گیا۔ پھر وغتنا ایلی کو خیال آیا کہ وہ تو ابھی بیٹن لشت پر ہی تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا کہ ایک نور کے کہنے پر وہ اپنے آپ کو اعتماد بنانے ہوئے تھا۔

”صرف ایک رونج کے لئے یا لو جی۔“ کاملاں کی متینیں گر رہا تھا۔ ”جب کانچ پھر کھلے تو صرف ایک رونج کے لئے یہاں آجائیں۔“ صرف ایک رونج کے لئے۔ جہاں اتنے رونج گوارے ہیں وہاں صرف ایک رونج اور۔ اگر آتے ہی بات نہ بنی تو سچا چاہیں دیں پر جو من گئی تو ٹھوک بجا کر انعام لوں گا۔“

”لیکن یہ ہو گا کیسے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”بس یہ نہ پوچھئے۔“ گامے جواب دیا۔

### پایا کھویا

علی پور پہنچنے کے بعد دوسرے چوتھے روز ہی شہزادے ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا اسے پنگ پر بٹھا دیا اور خود پاس کھڑی ہو کر سمجھدی گی سے کہنے لگی۔

”ایلی یہ تمہیں کیا ہو گیا۔“

”کیا ہو گیا ہے۔“ اس نے حیرت سے۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو؟۔“

”کیا کر رہا ہوں ۔۔۔ بیٹھا ہوں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”بات کو مذاق میں نٹا لو“ وہ بولی۔ ”جب تم امرتسر سے آئے ہو تمہارا انداز ہی بدلتا ہے۔ نگاہ بدلتی ہے۔۔۔ تم نے مجھے کیا سمجھا ہے ایلی۔

شہزادی آواز جذبات سے کانپ رہی تھی۔

”میں سمجھتی تھی تمہیں مجھ سے محبت ہے۔“ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ ”چلو محبت نہ کسی۔ مجھ سے محبت کوں گرتا ہے۔ اور میرے پاس اب ہے ہی کیا جو میرے ساتھ محبت کی جائے۔ لیکن لیکن پھر بھی میرا خیال تھا کہ تمارے دل میں میری عزت ضرور ہے۔ لیکن۔“ شہزادی پھلی نکل گئی۔

”آخر بات کیا ہے؟“ ایلی نے ٹھہر کر پوچھا۔

”بات۔“ وہ غصے میں بولی۔ ”تم تو مجھ سے یوں سلوک گرنے لگے ہو جیسے میں بازار میں بیٹھی ہوں جیسے۔“ وہ رک گئی۔ ”بازار میں بیٹھی ہوئی بھی یہ برداشت نہ کر سکے گی۔“

”راہ چلتے ہوئے چھپیرتے ہو۔ انگلیا کھوتے ہو۔ ہاتھا پائی کرتے ہو۔ سب کے سامنے اعلانیہ۔“ ”وہ رک گئی۔

ایلی کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ ”مریا خیال تھا کہ تم میں جرأت ہے۔“ اس نے سوچ کر کہا۔

”جرأت۔“ وہ نہی۔ ”جرأت کی بات کر رہے ہو مجھ میں وہ جرأت ہے کہ تم سب منہ میں انگلیاں ڈال لو۔ جرأت چھوٹی اور گری ہوئی باتوں میں نہیں ہوتی۔ تم نے ہمارا تعلق چھوٹی گری ہوئی بات بنادیا ہے۔ کیا ہوس کے لئے جرأت پیدا کروں۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”روتی کیوں ہو۔“ ایلی کچھ کہنے کے لیے بولا۔

”روؤں نتو کیا کروں۔“ وہ بولی۔ ”میں سمجھتی تھی کچھ پایا ہے اب معلوم ہوا کہ کھویا ہے۔“ پایا نہیں۔“

”تم سمجھتے ہو میں تمہاری طرف اس لئے بڑھی تھی کہ مجھے ہوں پوری کرنے کا شوق تھا یا جسم کی آگ کوٹھندا کرنے کی ہوں تھی۔“ اثاث میں نے تو ہوں پوری کرنے کے ذریعے سب توڑ دیئے میں نے اپنے خاوند سے تعلق توڑ لیا میں نے اس سے بات کرنی چھوڑ دی۔ منہ لگانا چھوڑ دیا۔ اور تم سمجھتے ہو کہ میں ہوں پوری کرنے کے لئے تمہاری طرف بڑھی تھی۔“ وہ رک گئی کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ایلی چپ چاپ بیٹھا تھا۔

”میں بھی آمُت ہوں۔“ وہ بولی۔ جو یہ سمجھنے تھی کہ میں تمہاری نگاہ میں بہت کچھ ہوں۔ مجھے کہی کی نگاہ میں بہت کچھ ہونے کی ہوں تھی۔ میں نے سمجھا مجھے دو جہاں کی امارت مل گئی۔ میں نے لوگوں کی نگاہ میں ذیل ہونا گوارا کیا میں نے لوگوں کے طعنے سننا گوارا کیا میں نے اپنی ماں کی زبان سے وہ وہ لفظ سنے جو کوئی سن کر برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہاری ماں بہن کے ننگے طعنے سنے اور بُنسُتی رہی۔ میں نے تمہارے طعنے سے تم یہ سمجھتے رہے اور سمجھتے ہو کہ میں ہر آتے جاتے کو مسکرا کر اپنے دام میں پھنساتی ہوں۔ تا کہ اپنی آگ کوٹھندا کر سکوں۔ میں نے تمہارا جالا پا بھی برداشت کیا اور یہ سب کس لئے۔ کیا صدمہ ملا مجھے۔ کہاب تم مجھے اپنی ہوں کا شکار بنا رہے ہو تمہاری نگاہ میری کوئی وقت نہیں تمہارے لئے میں ایک دل بہلا وا ہوں۔ ہوں پوری کرنے کا ذریعہ ہوں۔“

وہ رو نے لگی۔

ایلی چپ چاپ بیٹھا تھا۔

”یہ میری اپنی بد شُمتی ہے۔ خاوند ملا جو پہلے ہی کسی کی محبت میں پا گل تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا ہی نہیں۔ جب بھی وہ میری پاس آیا تو اس کی نگاہ میں میں نہیں انور ہوتی تھی۔ گویا وہ انور تو کہیں تھی ہی نہیں۔ اکیدیسا تھی کے بغیر۔ انور سے

ملانے کے لئے مجھے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور اب تم ہو \_\_\_\_\_ تم سادی کو بھولنے کے لئے تم \_\_\_\_\_ مجھے استعمال کر رہے ہو۔ ”یہ کہہ کروہ مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ ایلی چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا۔

اس کے ذہن میں ایک خلا پھیل رہا تھا۔ ایک دھند لکا۔  
شہادج کہتی تھی۔ امر تر سے واپسی کے بعد ایلی کا گویا نقطہ نظر ہی بدلتا گیا تھا۔  
اس کے لئے شہزاداب ایک خوبصورت عورت تھی۔ وہ اس کی طرف یوں دیکھتا تھا  
جیسے پچھے مٹھائی کی تو کرمی کی طرف دیکھتا ہے ایلی کی نگاہ میں شہزاداب کے ماتحتے کی ہندی  
معلوم ہو چکی تھی۔ اس کی دیوی نما آنکھیں ایلی کی نگاہ سے گویا اوجھل ہو گئی تھیں۔  
ان کی بجائے شہزاداب کے جسم کی گولیاں ابھر جائی تھیں۔ اس کے کوئے ملنے لگے  
تھے۔ اس کی کمر ریشمی جھولے کی طرح جھولے کی طرح جھولنے لگی تھی۔ اس کی  
سڈول پنڈلیاں برہنہ ہو گئی تھیں۔ اس کی نگاہ میں شہزاداب دیوی نہیں رہی تھی۔ شہزاداب کو  
دیکھ کر اب اس کی جیسیں میں سجدے پیتا بنا ہوتے تھے۔

لیکن ایلی اس واضح تبدیل سے بے خبر تھا۔ اور اس سے بے خبر رہنے کے لئے  
اس نے کئی ایک جواب اور دلائل پیدا کر رکھے تھے۔

ایلی خود ہوس کارنے تھا۔ اور ہوس کاری سے اس قدر بیگانہ تھا کہ محبت کا بہانہ  
بنائے بغیر وہ ہوس کاری کا کھیل نہیں کھیل کر سکتا تھا۔ اس کی ہوس کاری درحقیقت  
جذبہ کمتری سے بچنے کا ذریعہ تھی۔ شہزاداب پر بھوکی نگاہیں وال کروہ ثابت کرنا چاہتا تھا  
کہ وہ مرد ہے اور اس قابل ہے کہ کسی سے محبت کر سکے۔ درحقیقت وہ اپنی الیت کا  
سرٹیفیکیٹ پیش کر رہا تھا۔

یا شاید اس کی وجہ سادی سے محروم ہو۔

### ماتحتے کا اعلیٰ

ایلی وہاں۔ بیٹھا رہا تھا کے سامنے دھل گئے۔ شام پڑ گئی۔ پھر دینے جل گئے

اور لوگ چار پائیاں بچھا کر لیٹ گئے لیکن وہ جوں کاتوں بیٹھا رہا۔

پھر رابعہ نے آگر شور مچا دیا۔ ”یہ کیوں بیٹھا ہے۔ اٹھ باہر آ۔ یہاں کیا کر رہا ہے تو۔“ ایلی کو خاموش دیکھ کر اس نے شہزادہ کو آوازیں دیں۔ ”دیکھ تو اسے کیا ہے۔ یہ کیوں ساڈھو بنا بیٹھا ہے۔“ ”ایسا ہے۔“ شہزادہ اکتا ہوئی آواز میں بولی۔

نو بجے کے قریب بیگم آ کر بولی۔ ”یہ یہ بدھ مہاراج یہاں آلتی پاتی مارے بیٹھے ہیں۔“

پھر ہاجرہ اور فرحت آ لیں ۔۔۔ وہ دونوں چھٹی چلاتی رہیں۔ لیکن ایلی جوں کاتوں بیٹھا رہا کیا رہ بیجے کے قریب شہزادہ آتی۔

”اب کیوں مجھے ڈالیں کرو ہے جوں؟“ اس نے کہا۔ ”خدا کے لئے مجھے معاف کر دوں جانے غصے میں کیا کیا سمجھی ہوں۔“

”نہیں تم نے تو کچھ نہیں کہا۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”تو پھر تم اس طرح کیوں بیٹھے ہو۔“ وہ بولی۔

”کس طرح بیٹھوں۔“

”جس طرح روز بیٹھتے ہو۔ نہ سکھلو۔“

”کیسے کھیلوں کیسے نہیں کب تک ڈھیٹ بن کر ہستار ہوں۔“

”چلواب اٹھ بیٹھو۔“ شہزادہ نے پیار سے اپنا پا تھاں کے کندھوں پر رکھ دیا۔ ”مشہزادہ“ وہ بولا۔

”جی۔“

”میری ایک بات مانوں گی۔“ کیا۔

”چلو کہیں چلے جائیں۔“

”چلے جائیں۔“

”ہاں کہیں بھاگ جائیں۔“

”پاگل ہو گئے ہو۔“ وہ بُنسی۔ ”میرے ساتھ بھاگ کر۔ اپنی زندگی تباہ کرو گئے کیا۔“

”ویسے بھی تو تباہی ہے،“ وہ بولا۔

”ایسی نہیں کیا کرتے،“ وہ اس قریب تر ہو گئی۔

”مجھ سے اب بروایت نہیں ہوتا۔ میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔“

”ایسی باتیں نہ کرو۔“ وہ بولی ”مجھے اکساؤ نہیں۔ اگر ایک مرتبہ میں نے پرتوں لئے تو ایک ایسا طوفان بیٹھا دیا گی کہ تمہیں اپنے آپ کو اور ان سب کو تباہ کر دوں گی۔ مجھے نہ اکساؤ دیں۔ ان جا بکون تو رزو۔ اس طوفان کو رکار بننے دو۔“ بس میرے لئے یہی بہت ہے کہ تم میرے پاس ہو۔ تمہیں پالیا تو زندگی، تمہیں کھو کر میری موت ہے اور جو میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں تو میں تمہیں پاؤں نہیں۔ کھو دوں گی۔“

”مجھے اپنا باتھو دے دو۔“ ایلی نے شہزادے کہا۔

”میرا تو بس چلے تو میں اسے کاٹ کر تمہیں دے دوں۔“ وہ اپنا باتھ بڑھاتے ہوتے بولی۔

ایلی نے شہزادہ کا باتھ تھام لیا۔

”ہونہے۔“ بیگم اندر آ کر بُنسی۔ ”یہاں تو کچھ اور ہی ہو رہا ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔

شہزادے بیگم کو دیکھ کر باتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ بلکہ دوسرا باتھ بھی ایلی کو دے دیا۔

”تو بے حیائی کی کوئی حد ہوتی ہے۔“ بیگم چلائی۔

”نہیں اماں۔“ شہزادہ کر کہا۔ بے حیائی کی حد نہیں ہوتی حیا کی ہوتی ہے۔“

”تو بہے لڑکی،“ وہ چلائی۔ ”تو نے تو یہ گھر رنڈی کا چوبارہ بنار کھا ہے۔“

”ہی ہی چوبارہ۔“ وہ بُنسی۔

”شرم نہیں آتی“، بیگم بوتی بکتی ہوئی باہر نکل گئے۔

اس کے جاتے ہی شہزادی کی آنکھوں سے ٹپٹپ آنسو گرنے لگے۔

”تمہیں پانے کے لئے ایلی مجھے نہ جانے کیا کیا دینا پڑے گا۔ لیکن میں سب کچھ دے دوں گی۔ سب پچھرے خوشی سے لیکن تم پیرے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو۔ سب مجھے رندی سمجھتے ہیں۔ پڑے سمجھیں۔ لیکن تم مجھے رندی نہ سمجھو۔“ اس کی پچھلی نکل گئی۔

ایلی کی نگاہ میں اس کے جسم کی گولیاں بہت کر معدوم ہو گئیں شہزاد کا چہرہ پھر سے طوع ہو گیا۔ دیوبیو اوت آئی۔ اس کے ماتحتے کائل روشن ہو گیا۔

اس روشن شہزادی باتوں نے ایلی کو چونکا دیا وہ ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔ علی پور میں پندرہ روز اس نے سوچنے میں گزار دیئے۔ کیا مجھے سادی سے محبت ہے یا شہزاد سے۔ اس روز جب میں نے پہلی مرتبہ شہزاد کا حنا مالیدہ ہاتھ تھام تھا کیا اس لئے تھاما تھا کہ مجھے اس سے محبت ہو چکی تھی یا اس لئے کہ وہ ایک بانگی عورت تھی جسے آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کیا مجھے سادی سے محبت ہے۔ کیا میں نے محسوں کرنے کے بعد اس سے محبت جتنا تھی کیا یہ غلط ہے کہ کال کلوٹ کی خفت مٹانے کے لئے میں نے اسے جیتنے کی کوشش کی تھی۔ اور اپنی اناک تو سکین دینے کے خیال سے اسے جیت لیا تھا۔ تو کیا مجھے سادی اور شہزاد دونوں سے محبت نہیں۔ تیم سے بھی تو مجھے محبت نہ تھی میں نے اپنے باپ سے انتقام لینے کے لئے اس سے محبت رچائی تھی۔ تو محبت کیا ہے کیا مجھے کسی سے بھی محبت نہیں ہے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

اس کے باوجود ایلی کے دل میں شہزاد کا احترام تھا اس کی آرزو تھی لیکن سادی کے لئے اس کے دل میں ایک جذبہ تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ اسے پالے اور پھر اس کے

ساتھ ہی اس کے دل میں چمپی ہوئی آرزو تھی کہ وہ شہزاد کے سحر سے نکل کر نارمل زندگی بس کرے ساری بات ہی ایک الجھاؤ تھی۔ اور اس الجھاؤ سے نکلا ناممکن تھا۔

سوق سوچ کروہ تھک گیا اور پھر اس نے اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر پھینک دیا چلو کہیں تو کنارے لگوں کا۔

لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ افق سے پرے ایک طوفان اکٹھا ہو رہا ہے۔

### ایس۔ اے۔ وی

پندرہ روزہ کی چھٹی گزارنے کے بعد واپس ٹریننگ سنٹر کا ج لا ہو رہا ہے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایک معمولی نوکری بات کا یقین سریاں۔ کتنی مضبوط خیز بات تھی۔ اگر اس روز شہزاد ایلی سے بات نہ کرتی اگر وہ ایلی سے احتیاج نہ کرتی۔ اگر ایلی کی نگاہ میں شہزاد کا جسم چھائے رہتا اور اس کا ماتھے کا تل طوع نہ ہوتا اور وہ سوچ میں نہ کھو جاتا تو وہ غالباً لا ہو رہ جاتا۔ اور اس کی زندگی کا دھار اسکی اور طرف بہتا۔ لیکن اس ایک چھوٹی سی تفصیل نے حالات کا رخ بدل دیا۔

ایلی کو گامے کی بات کا چند اس یقین نہ تھا۔ ف اس خیال سے لا ہو رہا تھا کہ چلو چند روز کے لئے سینما دیکھیں گے۔ شاید کسی نوکری کا پتہ چل جائے۔ شاید شادی کے متعلق کوئی خبر ملے۔ نہیں تو سیر ہی سی۔

”تم اس قدر خاموش کیوں ہو، وہ بولی“ میں کیا کروں اگر تمہارا ہاتھ نہ روکوں تو میں اپنی نگاہ میں آپ گرجاتی ہوں اور روک دوں تو مجھے دکھ ہوتا ہے چونکہ تم برف کی طرح جنم جاتے ہو۔ کیا کروں میں۔“

وہ نہس پڑا۔ ”جو جی چاہے کرو۔ تمہارے بس میں ہوں۔“

شہزاد کی آنکھوں میں محبت بھری چمک لہرائی۔ ”میں آؤں گی، وہ بولی“ میں خود تم سے ملے آؤں گی میں لا ہو رہ آؤں گی۔“

”تم، وہ بولا“ لا ہو رہ آؤں گی۔“

”تم ملنے کے لئے میں سات سمندر پار جا سکتی ہوں یہاں لا ہو رہے ہیں۔“

لا ہو رہا بورڈنگ پہنچتے ہی گا ما دوڑا ایلی کے پاس آیا۔ ”2 گئے بابو جی بڑا اچھا کیا  
میرا انعام ساتھ لائے ہیں نا۔“

ایلی نے خرت سے گامے کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی اسے اپنی بات پر اس قدر  
یقین تھا۔ بہر حال اسے سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ معجزہ کیسے رونما ہو گا۔

اگلے روز جب ایلی کلاس میں پہنچا تو ایک نہیں چھڑ کے غیر حاضر تھے وہ اڑ کے  
جن کو چن لیا گیا تھا اور جن کے نام رجسٹر میں درج تھے۔ فتحا ایلی کی نگاہ سے گویا  
پردہ ہٹ گیا۔

گامانہنے لگا۔ ”بابو جی ہر بار ایسا ہوتا ہے کسی کو نکری مل جاتی ہے کوئی کسی اور لیں  
میں چلا جاتا ہے۔ کوئی ویسے ہی نہیں آتا۔ ہر سال دس ایک بابو چھٹیوں کے بعد نہیں  
لوٹتے۔ بس پھر جو مو جو دھو اس کا نام رجسٹر پر آ جاتا ہے۔ ہاں بابو جی تو ڈاکٹر میں  
ختم ہو گا۔ نہ جانے کتنے اس میں کٹ جائیں گے۔“

چوتھے روز ہی ایلی نے جماعت میں شور مچا دیا۔ جی میرا نام آپ بولتی ہی نہیں  
میں بیٹھن لشک والا ہوں میرا نام رجسٹر میں نہ ہو گا تو حاضریاں کیسے پوری ہوں  
گی۔

\_\_\_\_\_

ایلی کا نام رجسٹر میں درج کر لیا گیا۔

سنٹرل ٹریننگ کالج کی عمارت بھائی دروازے کے قریب ایک وسیع چوگان  
میں واقع تھی۔ ایک طرف کالج کی عمارت تھی جس کے شرقی اور غربی پہلو میں بڑے  
بڑے لان تھے۔ شمال میں بورڈنگ کی عمارت ایک وسیع دائرے میں بنی ہوئی تھی۔  
صدر دروازے کے اردو گردواریہ کمرے تھے جن کے اوپر چوبارے بننے ہوئے تھے  
اوپر کی منزل میں بورڈنگ کے سپر غنڈٹ لالہ جی مقیم تھے نچلے کروں میں ملاقات  
کا کمرہ۔ کومن روم اور دیگر کمرے تھے۔ ان کروں سے گزرنے کے بعد بورڈنگ کا  
وسیع صحن تھا جس میں لان بننے ہوئے تھے ایک با غچہ تھا۔ لان کے اختتام پر ایک

اوپنچی دیوار تھی جس میں سات دروازے کھلتے تھے۔ نیز دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی ایک بہت لمبا صحن۔ جس کیت ساتھ ساتھ ایک برآمدہ اور ایک بہت لمبا کمرہ بناتھا۔ یہ لمبا کمرہ ڈار میٹری کہلاتا تھا۔ اسی ساخت کی کل چھوٹا ڈار میٹریاں تھیں ہر ڈار میٹری میں ۲۵ لڑکوں کے زیارت کی جگہ تھی۔ ساتوں میں ڈار میٹری میں کچھ نوکروں کے رہنے کی جگہ اور ڈائینک ہال تھے۔

چند ایک ڈار میٹریوں میں ہر سیٹ کے بعد ایک چھوٹی سی پارٹیشن لگتی تھی۔ یہ ڈار میٹریاں بیٹی طلباء کے لئے مخصوص تھیں۔ پارٹیشن کے بغیر جتنی ڈار میٹریاں تھیں وہ سب ایسے وی کے طلباء کے لئے تھیں۔ بورڈنگ میں داخل ہونے کے لئے صدر دروازے کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ ڈار میٹریوں کے گرد اوپنچی دیواریں بنائی گئی تھیں۔ باہر کھلنے والی کھڑکیوں پر لوہے کی مضبوط جالی لگتی ہوئی تھی۔

یہ بورڈنگ دوسرے کالجوں کے عام بورڈنگ کی طرح نہیں تھا۔ یہاں بہت سی قیود اور پابندیاں تھیں۔ باہر کا مہمان بورڈنگ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مہمان کو ملنے کے لئے کوہاں کے کوہاں ملاقاتی کرے میں جانا پڑتا۔ رات کو وہ بیچ صدر دروازہ بند کر دیا جاتا اس کے بعد کسی کو اندر آنے کی اجازات جا کر جھر میں حاضری لگاتے اور غیر حاضر طلباء کی روپورث کی جاتی اور عادی طور پر غیر حاضر ہنے والے کو کانج سے نکال دیا جاتا۔ ایلی کو وہاں پورے آٹھ مہینے گزارنے تھے۔

اسی روز نہ جانے کیوں وہ چلتے ملاقاتی کرے میں رک گیا اچھا خاصہ کمرہ ہے اس نے سوچا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور پھر سوچتے سوچتے نہ جانے کہاں جا پہنچا۔  
اگر منصر ملنے آئے تو وہ یہاں آئے گا اور پھر

”اے تم۔“ جی کے اندر جھاکتے ہوئے چلایا۔

ایلی چونکا۔

”تم یہاں کس سے ملنے آئے ہو۔ کیا مجھ سے؟“

”تم جی کہ تم یہاں۔“ ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تم ہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں؟“

”تم یہاں ہو۔“ ایلی تعجب سے بولा۔

”تم کس سے ملنے آئے ہوئے؟“  
”کسی سے بھی نہیں۔“

”تو پھر۔“

”بھائی میں یہاں ہوں۔“

”یہاں تو ہوئیں اس طرح آئے ہو۔“ جنی کے بولے۔

”بھائی میں اسی کالج میں ہوں۔“

”کیا کہا۔“

”کیا تم بھی یہاں داخل ہوئے ہو۔“

”بالکل \_\_\_\_\_ لیکن یاریہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنے دن سے ہم دونوں یہاں ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھاتک نہیں۔“

”تم تو بیٹی میں ہو گے۔“

”ہاں ہاں۔“

”میں تو ایسے وی میں ہوں۔“

”پھر بھی رہتے تو اسی بورڈنگ میں ہونا۔“

”جنی کے نے ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا اسے ملاقاتی کمرے سے باہر لے گیا۔ وہ ناج رہا تھا جیخ رہا تھا تالیاں بجارتھا۔“ یاریہ تو بہت اچھا ہوا۔ بہت اچھے بہت اچھے دونوں اکٹھے رہیں ادھر آؤ ادھر۔“ وہ اسے اپنی ڈیوڑھی سے ملحقہ ایک کمرے کی طرف لے گیا۔

”یہ کہہ لئے جا رہے ہو۔“ ایلی نے پوچھا۔

ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ کر اس نے ایلی کو کرسی پر بٹھا دیا۔ ”اب آرام سے بات کرو۔ وہ چائے پلاوں گاتھمیں کھنا و گھر بھول جاؤ گے۔“

”لیکن یہ کہہ کس کا ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”میرا اپنا کمرہ ہے۔“ پالی نے چھاتی لٹوکن کر کھا۔

”لیکن یہاں تو وزیریوں میں رہتے ہیں سب۔“

”پڑے رہیں میں تو ان خپر پاتری اصطبلوں میں نہیں رہ سکا۔ اور اب تم بھی یہیں رہو گے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ابھی اپنا سامان یہاں منتقل کرو یا تو چار سیوں کے لئے ہے لیکن ہم اسے ڈبل شیر بنالیں گے۔“

”لیکن پر غنڈٹ۔“

”لالہ جی۔“ وہ چلایا ”لالہ جی“ میری ہربات مانتے ہیں۔ ان کی فکر نہ کرو۔“

ایلی کا سامان اسی روز جی کے کمرے میں آگیا اور وہ دونوں وہاں اکٹھے رہنے لگے۔

### چھوڑ کیاں

سنٹرل ٹریننگ کالج میں زندگی ایک محور کے گرد گھومتی تھی۔ اور یہ محور چھوڑ کیاں تھیں۔ یہ رکیاں بیٹی گلاس کی طلباء تھیں۔ دن بھر کالج کے وفتر بیٹی کے طلباء شدت سے محسوس کرتے کہ وہ گلاس میں بیٹھی ہیں۔ ان کے منہ سے لکلا ہوا ایک ایک لفظ سن رہی ہیں ان کی ایک ایک حرکت کو نٹ کر رہی ہیں۔ صرف لڑکے ہی نہیں۔ بیشتر پروفیسر بھی ان کی موجودگی کا شدید احساس رکھتے تھے۔

ایں اے وی کے طلباء کو یہ احساس ہوتا کہ ساتھ والے کمرے میں رکیاں ہیں ایک نہیں چھ۔ اور ان کے اپنے کمرے میں کوئی بھی نہیں۔ اور ابھی جب وہ حساب کا

پھر یہ ختم کر کے برآمدے سے گزر کر جغرافیہ پڑھنے کے لئے جائیں گے تو راستہ میں گزرتے ہوئے انہیں دیکھیں گے۔ وہ تیجی نگاہ کئے بیٹھی ہوں گی۔ یوں کام میں منہمک ہوں گی۔ جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو مگر اس کے باوجود انہیں سب خبر ہوگی۔ ہر لڑکا یہ سوچتا کہ وہ اس کی چال دیکھیں گی۔ یہ دیکھیں گی۔ کہ اس نے کیسے کپڑے پہن رکھے ہیں ؟ اس بینگ کی ہے۔ بال کیسے بناتا ہے۔ اور اس کا انداز کس قدر رومانٹک ہے کاچ سے فارغ ہو رجب وہ بورڈنگ میں آ جتے تو آپس میں ان کے متعلق بحثیں کرتے۔

”بھتی میں رو ہو بڑی چلا لاک ہے بن دیکھے بابت تاثر جانی ہے۔“

”یار آج مس مینانے حصہ کرویں فتح ایسی نکاد والی کا پنہ ہوش گم ہو گئے۔“

”آج مس راد حاشام کے ساتھ ٹک شاپ میں گئی تھی۔“

”اور دیکھا تھام نے مس مینانے کیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یار بڑا اکثر سن سے ہے اسے۔“

وہ لڑکیاں چند اس خوب صورت نہ تھیں نہ ہی ان میں زندگی کی خصوصی چمک تھیں الٹا وہ سب سنجیدہ اور خاموش تھیں اس کے باوجود ان کا توجہ کا مرکز ہونا۔ وجہ فقط یہ تھی کہ اس زمانے میں کالج میں مخلوط تعلیم رائج نہ تھی۔ سنٹر ٹریننگ کالج واحد کالج تھا جس میں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ تعلیم پاتی تھیں۔ اسی وجہ سے گورنمنٹ اور مشن کالج کے طلباء بھی بہانے بہانے سنٹر ٹریننگ کالج آیا کرتے تھے تاکہ ایک نظر انہیں دیکھیں اور اگر ممکن ہو تو شاید کوئی راستہ نکل آئے۔

بیٹی کے پانچ چھوٹ کے تو ہر وقت ان کے گلے کا ہار بننے رہتے تھے۔ وہ جیب میں زائد پیسل اور قلم رکھتے اس بات کے منتظر رہتے کہ کب ان میں سے کسی کے قلم کی سیاہی ختم ہو یا پیسل کا سکلہ ٹوٹ جائے تاکہ انہیں پیسل یا قلم پیش کر سکیں۔

وہ بڑی محبت سے کلاس کے لکھپروں کے نوٹ لکھتے اور بورڈنگ آ کر بنا سنوار کر

انہیں نقل کرتے کہ شاید لڑکیوں کو نوٹ پڑھنے کی ضرورت محسوس ہو۔ جیب میں زائد رومال اٹھائے پھرتے نہ جنے کب کوئی لڑکی لان میں بیٹھنا چاہے تاکہ وہ فوراً رومال گھاس پر چھا دیں۔ ان لڑکوں کو کوٹ برادر کہا جاتا تھا چونکہ وہ لڑکیوں کے کوٹ اٹھائے پھرتے تھے۔ اکثر ایک کے نظر سے انہیں وکٹ برادر کہا کرتے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ کوٹ برادری ایک بڑا عز از سمجھا جاتا تھا اگر کوئی لڑکی کسی کو اپنا کوٹ اٹھانے کے لئے دے دیتی تو وہ لڑکا پھولے نہ سماتا اور اس بات پر غر کرنا دوسرے لڑکے اس کا ناق ازانتے و پردہ اسے خسین بھری نظروں پر دیکھتے۔

ایلی کے لئے یہ محو قطعی طور پر بچپی سے خالی تھا۔ ان چھوٹیں نہ تو کوئی سادی تھی اور نہ شہزاد۔ اور پھر وہ تھیں بھی یا ایک دلو والدہ مم کی تھیں ایک دو وہ چیزیں بن چکی تھیں جو کتابیں جمع عینک جمع دبلا پن جمع جلی کی زکاہ جمع نسوانیت کا فتقان کا مجموعہ ہوتی ہیں وہ ایک البتہ قبول صورت تھیں مطلب ہے اپنی خاصی وہ خاموش رہتی تھیں۔ نہستی نہ تھیں کہ کوئی ان کی بھنسی کو التلاف نہ سمجھ لے۔ آنکھیں نہ مٹکاتی تھیں کہ کوئی ان کی چتوں کی جنبش کو اشارہ نہ سمجھ لے مکمل کر بات نہیں کرتی تھیں کہ کوئی بات منہ سے نکل نہ جائے۔

ایلی کے کانوں میں ابھی تک سادی کی باقیں گوئی تھیں اس کی نگاہوں میں شہزاد کے ماتھے کائل شنگرف کی طرح چمک رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ایلی کے لئے وہ چھلک کیا جاذب نظر تھیں جماعت میں بیٹھے ہوئے وہ یہ آرزو کرتا کہ جلدی پھر یہ ختم ہو اور وہ برآمدے سے گزرے۔

## موٹی موٹی کتابیں

سنٹرل ٹریننگ کالج میں داخل ہوتے ہی ایلی پنجاب پیلک لاہوری کا ہمبر بن گیا تھا جہاں سے اسے بیک وقت آٹھ کتابیں مستعار مل سکتی تھیں اور وہ ہر ہفتے موٹی تھیں کتابیں چن کر لایا کرتا تھا ایلی نے کتابوں سے از سر نو وچھپی پیدا کر لی تھی۔ اور

اس کی وجہ سرف یہ تھی کہ لڑکے لڑکیوں سے کتابوں کی باتیں کیا کرتے تھے۔

”آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے کیا۔“

”فلاں مصنف نے تعلیم کے متعلق ایک انوکھی تھیوری پیش کی ہے۔“

”نفیات میں دلچسپی ہوتی فلاں مصنف کا مطالعہ کرو۔“

ایلی کالج کے اوقات میں کتابیں لانے کا خاص پروگرام بنایا کرتا تھا۔ اگرچہ اسے کافی لمبا چکر کا شاپٹا لیکن لارڈ بری سے آتے ہوئے وہ ایسا راستہ اختیار کرتا۔ کوہاپسی پر اسے کالج کے ہر آمدے سے گزرنا پڑے اور وہ کتابوں کے اس انبار کو یوں اٹھائے پر آمدے سے گزرتا جیسے اسے بھرہی نہ ہو کہ وہاں بیٹی کلاس میں لڑکیاں بیٹھی ہیں اور وہ اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہی ہیں۔ جب وہ کتابیں اٹھائے ہوئے ہوتا اس وقت اس کے لئے ضروری ہو جاتا کہ وہ لڑکیوں کی طرف قطعی طور پر نہ دیکھے لیکن وہ اس انداز سے اٹھاتا کہ ان کی پشتیں واضح طور پر دکھائی دیں۔

جاہ کی صحبت کی بدولت ایلی چند ایک مشہور مصنفوں کی کچھ کتابیں پڑھ چکا تھا اس مطالعہ کی ابتداء برٹنڈرسل سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے مکملے ہالڈین شاپن ہارستنیانا کی چند ایک کتابیں پڑھی تھیں۔ پھر الفار منصر سے متاثر ہو کر اس نے داستوں کی اور انگریزی نظموں کا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وادی سے مطالعہ سے براہ راست خاص دلچسپی نہ تھی۔ جب کبھی سادی کی یاد اسے ستاتی تو وہ اپنی توجہ منعطف کرنے کے لئے نظر یا بر گستاخ کی کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش کرتا یا جب کبھی شہزاد کے روپے سے وہ محسوس کرتا کہ وہ کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہو رہی ہے تو وہ احتجاج کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور بعد مشکل اس کے چاراً یک صفحات پڑھتا لیکن پھر اسے نفس مضمون سے دلچسپی محسوس ہونے لگتی اور اس طرح اس کا مطالعہ منفی حیثیت چھوڑ کر ابتدائی حیثیت اختیار کر لیتا۔ بہر حال مطالعہ اس کے لئے محض فرار تھا۔

سنٹر ٹریننگ کالج میں بھی اسے زیادہ تر دلچسپی کتابیں لانے اور ان کی نمائش کرنے سے تھی۔ کتابیں جو وہ لاتا تھا۔ تمام فلمے سے متعلق ہوتی تھیں۔ یا فزیکس کے ایسے مسائل کے متعلق جن میں فلمے کارگ حاوی تھا۔ ناول پڑھنے سے اسے چند اس دلچسپی نہ تھی۔ چونکہ ناول میں عشق و محبت کی راستائیں ہوتی تھیں اور پڑھتے ہوئے اسے شہزاد کا کمرہ یا داؤ جاتا سادی کے مکان کی وہ سیر ہیاں جہاں وہ رات کے اندر ہیرے میں ملا کرتے تھے اس طرح مطالعے کا مقصد فروٹ ہو جاتا۔ اس نجیدہ قسم کے مطالعے سے اس کے جذبات کی چلکن تو دور نہ ہو سکتی البتہ اس کے چہرے پر عجیب قسم کی رختکانی پیدا ہو گئی۔ جیسے زیادہ بلے ہوئے اندرے پر ہوتی ہے اس کا چہرہ بورہ اہوا جا رہا تھا ٹھوڑی نکتی آدمی تھی۔ اولاد پیشانی پر گہری تیوری قائم ہوئی جا رہی تھی۔

شاید ان نمائش کتابوں کو کبھی نہ پڑھتا لیکن جی کے طعنوں نے اسے مجبور کر دیا ان طعنوں سے مخلصی پائے کیلے چاروں چارا سے ہر روز وہ کتابیں کھول کر بیٹھنا پڑنا۔

## جی کے

جی کے ایک نہیں بلکہ دو مزاج تھے۔ وہ بیک وقت بے حد خوشامراج اور بہت دلکھی آدمی تھا۔ ان دو مزاجوں کی کھینچاتانی جی کے کی زندگی کا حاصل تھی۔ جب وہ چپ ہوتا تو بالکل ہی چپ ہو جاتا۔ اس کی طو طانما خدا رنا ک کی دیوار پر بد مزاجی کا دلہیر لگ جاتا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں دکھ کے انبارت لگنا شروع ہو جاتے۔ جب وہ بات کرنے کے موڑ میں ہوتا تو وہ باتیں کئے جاتا۔ شور مچاتا۔ نداق کرتا۔ شوخ باتیں کرتا۔ اس وقت اس کی کیفیت یوں ہوتی جیسے سوڈے کی بوتل کھل گئی ہو۔ چینے اڑتے بلے اٹھتے اور سب کو بھگو دیتے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ جی کے کا اصلی مزاج کونسا تھا اور نقی کونسا۔

بہر صورت ایلی کے نزدیک جی کے کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی اناپنہ  
ی تھی۔ وہ اپنے خیالات کو درست سمجھتا تھا اپنی بات کو حق تصور کرتا اپنے جذبات کو  
خارجی حالات کا مناسب رو عمل سمجھتا تھا۔

جی کے از لی طور پر آقا طبیعت کا مالک تھا۔ اس کا برداشت و محبت رعوت کرختی خود  
اعتمادی اور ذہانت کا مجموعہ تھا۔ وہ اپنے حلقے کا از خود صدارتی جاتا اور پھر صدارمان  
لیا جاتا۔ اس بات پر ایلی کو بے حد غصہ آتا تھا۔ ایلی میں صدارتی کی نہ تو ہو سکتی اور  
نہ امداد۔ وہ طبعاً کسی کے پیچھے چلنے پر مجبور تھا لیکن جب پیچھے چلتا تو محسوس کرتا کہ  
اسے پیچھے چلنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اور یہ زیادتی ہے۔ اہذا سے غصہ آنا شروع ہو  
جاتا دراصل وہی طور پر ایلی میں شدت کی فراہدیت موجود تھی وہی طور پر ایلی مضبوط  
تھا لیکن طبعی طور پر بے حد گزرو اور بودا تھا اس یہے جی کے کی اناپنہ سے بے حد  
نالاں تھا۔

مثلاً ایلی کتابوں کو دیکھ جی کے طفر اچلاتا۔

”ارے یہ کتابیں پڑھے گان۔“

”کچھ نہ کچھ تو دیکھ لوں گا۔“ ایلی جواب دیتا۔

”کیوں ان میں تصویریں ہیں کیا۔“ جی کے کی طفر شدت اختیار کر لیتی۔

”نہیں تو۔“

”تو پھر دیکھنے کا کیا مطلب؟“

”مطلب ہے کچھ نہ کچھ پڑھوں گا۔“

”یہ فرائید و ائسن۔ ایس۔ جیم جیز و رڈ زور تھے۔ انہیں پڑھو گے تو تم لیکن سمجھے  
گا کون؟“

”تم جو ہو تمہاری مدد سے کچھ پتہ چل ہی جائے گا۔“ ایلی طفر اکھتا۔

”اوہ ہوں۔ بھی ہم تو حساب دان ہیں۔ حساب کا کوئی مسئلہ لے آؤ۔“

لیکن یہ فلسفہ اور نفیاں اور جنیات یہ پانے بس روگ نہیں۔“

جی کے کی ان باتوں کی وجہ ایلی کو لازماً ہر روز کسی ایک کتاب کو کھول کر بیٹھا پڑتا پھر وہ بھول جاتا کہ اسے صرف کتاب کھول کر بیٹھنا ہے پڑھنے کی چند اس ضرورت نہیں۔ پڑھنے کی جگہ وہ سادی کی خوش گپتوں کے متعلق سوچ سکتا ہے شہزاد کے حسین جسم کا تصور کر سکا ہے پہلوئے حور میں انگور کے واقعہ پر غور کر سکتا ہے لیکن اس واقعہ پر غور کرنا تو ایلی کے لئے بے حد تکلیف وہ تھا۔ اب تو یہ صورت پیدا ہوئی جا رہی تھی کہ سادی کا خیال آتا تو اسے خیس لگتی اور وہ شدت پرے محسوس کرتا کہ سادی ہمیشہ کے لئے چلائی۔ نہ جانے کہاں چلی گئی۔ اگر وہ رہتی وہیں لاہور میں رہتی تو والد صاحب کا انکار بھی بے معنی ہوا لہرہ جاتا۔ کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی۔

جی کے کوکاچ کی ان چھپڑ کیوں سے قطعی و تجیبی نہ تھی۔

”لا حول ولا قوۃ“ وہ چلاتا۔

”یہ لڑکیاں سب کے اعصاب پر سوار ہیں۔ اور پھر لڑکیاں کہاں وہ تو بیشتر عورتیں ہیں والدہ قسم کی عورتیں۔ کیوں ایلی کیا تمہیں والدہ قسم کی عورت دلچسپی ہو سکتی ہے۔“

جی کے سوال سن کر ایلی کا دل دھک سے رہ جاتا۔ اس کے رو برو صفیہ آکھڑی ہوتی اور اپنے حنایا میدہ ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی۔ خانم گورے گدے سے ہاتھوں سے اس کے گال سہلاتی۔ ایلی کو والدہ قسم کی عورت سے دلچسپی نہیں بلکہ عشق تھا۔ عورت درحقیقت اس کے ذہن میں بھرے بھرے جسم کی ایک گود تھی جس کے پہلوؤں پر بازو اور ہاتھ لٹکتے تھے جو سہلاتے اور تھکنے کے لئے بے قرار تھے لیکن ایلی نے کھلے طور پر اس شدید جذبے کو کبھی اپنایا نہ تھا۔

”لا حول ولا قوۃ“ وہ گویا شدت جذبات کا اظہار کرتا۔ نہ جانے کیوں یہ سب پاگل ہو رہے ہیں۔ کیوں پاگل ہو رہے ہیں۔ بتاؤ نا۔ بول۔“ جی کے ترنگ میں

آجاتا ”جواب دو۔“

”یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔“ ایلی کو جی کے پر غصہ آئے گلتا۔

”کیا مطلب؟“ وہ چلاتا ”نوجوان والدہ قسم کی عورتوں کو پسند کریں۔ عجیب بات

نہیں کیا۔“

”نوجوان نہ کریں تو کیا یوڑھے کریں گے۔“ ایلی جواب دیتا۔

”تم بھی بے قوف ہو۔“ جی کے جوش میں آجاتا۔

”ہم دونوں ہی بے قوف ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم نہیں اپنی حماقتوں کا

احساس نہیں۔“

”بالکل غلط۔“ وہ چلاتا تھا ہم تو نہیں۔ ہم تو داش ور ہیں۔ دراصل یہ

فرانسیڈ پڑھ پڑھ کرم اپنے آپ کو تباہ کر رکھتے ہے بات کرنا بے کار ہے تم نہیں سمجھ سکتے۔“

جی کے انٹھ کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ وہ خاموش وہ جاتا۔ اس کی ناک پر بد مزاجی کے ذہیر لگ جاتے آنکھوں سے دکھ جھانکتا۔ مظلومیت کی پھوار پڑتی۔

جی کے کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے آپ کو بے حد مظلوم سمجھتا تھا۔ اسے یہ خیال تھا کہ وہ قربانی کا بکرا ہے۔ دوسروں کے مفاد کے لئے وہ اپنے

خیالات یا مفاؤ کی قربانی نہیں دیتا تھا سمجھتا تھا کہ وہ رہا ہے۔ لہذا وہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا تھا ایلی۔

اس قسم کے خیالات سے اسے مستفید کرتا تھا لیکن اس کے باوجود ایلی سمجھتا تھا ایلی۔

اس قسم کے خیالات سے اسے مستفید کرتا تھا لیکن اس کے باوجود ایلی سمجھتا تھا ایلی اور پھر دوست بھی ایسا جس کے لئے اس نے کیا نہ کیا ہو۔

چپ ہو جانے سے پہلے جی کے ایلی کی طرف ایک نگاہ ڈالتا بالکل وہی ”واو ٹو برولس،“ والی نگاہ۔ اور پھر سیر زکی طرح آر اقم کری میں گر جاتا اور ایلی کے متوقع خیز

کے وار کا انتظار کرتا پھر اسے غصہ آتا کہ متوقع وار میں تاخیر کیوں کی جا رہی ہے۔ تاخیر کا مقصد یہ ہے کہ جی کے کے کرب میں اضافہ کیا جائے۔

ایلی کو یہ سب باقی دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ اسے صرف جی کے کی پچولی ہوئی تاک نظر آتی تھی جس پر بد مزاجی کے انبار لگے ہوتے۔

پھر ان کے دوستوں میں سے کوئی آ جاتا۔ مثلا بابا شام پریم رائے یا جان۔

”اوے تم دونوں اندر بیٹھے ہو۔“ شام چلاتا ”ہائی میں یہ لیاس اتنی موٹی کتاب پڑھ رہا ہے۔“

”یہاں تو بڑا بڑا کتابیں پڑھی جاتی ہیں اس کمرے میں۔“ جی کے بڑے

رعب سے جواب دتا۔ ۲۰۰۲-۲۰۰۳ء  
rights reserved.  
© 2002-2003  
www.babasham.com  
www.babasham.com  
www.babasham.com

”کیا ہے یہ۔“ شام پوچھتا۔

”تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی پوچھنے کا فائدہ۔“

ایلی کو اس بات پر اور بھی غصہ آتا۔ لو۔ بھی ان موٹی کتابوں پر تمسخر کر رہا تھا اور

اب پر فخر کا اظہار کر رہا ہے اور وہ بھی ایسے انداز میں جیسے وہ کتابیں اس کی اپنی ہوں اور اس نے ایلی کو پڑھنے کے لئے مستعار دی ہوں اور ساتھ ہی نفس مضمون کو سمجھنے

میں ایلی کی انداد کا بیٹر اٹھائے ہوئے ہو۔

جی کے اکثر ایلی پر بھی فخر کا اظہار کیا کرتا تھا۔ لیکن اس اظہار میں ایلی کی عظمت

کی عصر نہ ہوتا بلکہ ایلی کی عظمت کا پہلو نکلتا۔ مثلا دوسروں کے روپ و وہ ایلی کی دوستی

پر فخر کا اظہار کرتا تو ایسے محسوس ہوتا جیسے کہہ رہا ہو۔ دیکھا ہم وہ ہیں جس کے ایسے دوست ہیں۔

بابا

لڑکیوں کے متعلق کئی ایک مختلف زاویہ نظر رائج تھے۔ بابا کا نقطہ نظر بہت دلچسپ تھا بابا کا نام آرزنگ تھا اس کی عمر چالیس برس تھی چہرہ ڈھلک چکا تھا۔ جسم میں بیل کی

سی بے حصی۔ صرف آنکھوں میں شرارت چمکتی اور وہ بھی مخصوص اوقات پر۔ اس کے کل نوبچے تھے۔ بہت سی پیٹیاں اور جھوڑے سے بیٹھے۔ اسے یاد نہیں تھا کہ وہ کب سے بچے پڑھانے کا کام کر رہا ہے پوچھو تو کہتا ”بس سمجھ لو جب سے آدم نے پھل کھایا ہے تجھی سے پڑھانے کی نوکری کر رہا ہوں۔ شاید اس سے بھی پہلے سے۔ اور اب سالوں نے مجھے ریفریش روکورس کے لئے یہاں بھیج دیا ہے۔“

اس عمر کے باوجود بابا نبیا دی طور پر محبوب واقع ہوا تھا۔ لڑکیوں کی بات چھڑر جاتی تو نہ کہتا ”تم کوئی لڑکیوں کی بات کر رہے ہو۔ سارا دن بھی لوگ لڑکیوں کا رونا روتے ہیں۔ ہم تو کوئی لڑکی نہیں دیکھی یہاں نہ۔“ ”بابا۔“ ایلی چالا کیا۔ ”ایک نہیں چھپیں جائے۔“ ”ہوں گی بھائی۔“ وہ بے پرواں سے کہتا۔ ملکین ہم نہیں مانتے اگر وہ لڑکیاں ہیں تو بھائی خود بخود ہمارے پاس کھنچی چلی آئیں گی۔ آج تک تو ایسا کبھی نہیں ہوا اور خود بخود ہماری طرف نہ کھنچی چلی آئے۔“ ”ویکھاتو کرتی ہیں تمہاری طرف۔“ ایلی نے اسے چھیرا۔ ”بابا۔“ جی کے چنتا۔ ”وہ تو والدہ قسم کی ہیں تمہارے جوڑ کی ہیں۔“

”اے تجھے کیا پتا“ بابا ہنسا۔ تو وہ اور دو چار کے سوا کیا جانتا ہے جو والدہ قسم کی ہوتی ہیں۔ وہ تو اثاثا اپنی گود ہری رکھنے کے لئے لمڈے تلاش کرتی ہیں۔ ہاں اگر لڑکی ہو تو وہ البتہ ”وہ اپنے منہ پر ہاتھ پھیر کر کہتا“ مرد ڈھونڈھے گی۔ دیکھ لینا ایک نا ایک دن ہمارے پہلو میں پہنچ کر رہے گی اگر ان میں کوئی لڑکی ہے تو۔ اور اگر نہیں تو ہٹاؤ سب کی سب تمہیں کشیں۔“ وہ شام سے کہتا ”ہم گود میں بیٹھنے کے قابل نہیں بٹھانے کے ہیں۔“

بابا کی شخصیت میں ایک عجیب سی مٹھاں تھی اس کے انداز میں جذباتی گرمی منعکس ہوتی تھی۔ ایک عجیب سائل۔ اس سے چاہے بات کرو نہ کرو ایسے محسوس

ہوتا جیسے وہ تمہارے پاس بیٹھا ہو۔ تمہارے دکھو رو میں برا بر کا حصہ وار ہو۔ اول تو وہ بحث کرنے کا عادی ہی نہیں تھا اور اگر کبھی دوسرا کو جھٹلاتا تباہی تو دوسرا محسوس کرتا کہ درحقیقت دل ہی دل میں وہ اس کا ہم خیال ہے ویسے از راہ مذاق اختلاف رائے کا اظہار کر رہا ہے۔

## شام

شام گویا ناچی ہوئی سورج کی ایک کرن تھی۔ جہاں بھی وہ پہنچ جاتا وہ جگہ انبساط کے دو دھیا اجائے سے مخمور ہو جاتی۔ نجیدہ سے نجیدہ بحث کے دوران میں شام آ جاتا تو بحث خوش گوارنمنٹو میں بدل جاتی دلائل زندگیں اشارات کا انداز اختیار کر لیتے۔

شام ایم۔ ایس۔ سی کر چکا اور اب بیٹے میں اس لئے داخل ہوا تھا کہ اس زمانے میں انکری ملنی بے حد مشکل تھی۔ لیکن اس کے رویے سے کبھی ظاہر نہیں ہوا تھا کہ وہ ایم۔ ایس۔ سی ہے۔ اس سے پوچھتے ”یار تم ایم۔ ایس سی۔ ہو۔“ تو وہ نہ س کہتا ”اہم۔ ایس۔ سی ہوتا تو اب ابے بی سی میں کیوں داخلہ لیتا۔“

لڑکیوں کی بات چھڑ جاتی تو وہ نہ س کر چلا تا ”یار ہم تو فیل ہو گئے کوئی اپنی طرف تو دیکھتی ہی نہیں حالانکہ قسم ہے پر ماتما کی منہ پر روز کریم مل کر آتا ہوں۔ شیو کے بعد اسٹرجنت اگاتا ہوں۔ بیال بڑی اختلاط سے بناتا ہوں۔ کلاس میں جان بو جھ کر چکدار باعثیں کرتا ہوں۔ ذہانت اور رنگینی سے بھرے ہوئے جتنے جملے یاد ہیں ان کا بروقت بمحفل استعمال کرتا ہوں لیکن سب بے کار وہ دیکھتی ہی نہیں اپنی طرف۔“

”کوئی نہیں دیکھتی۔“ جی کے پوچھتا۔

”کوئی سی ہے دیکھ لے بھائی اس میں کیا ہے۔ بھوکے کیک پیش ری نہیں مانگا کرتے اور میاں وہ انگریز نے کہا ہے نا بھئی کیا خوب کہا ہے۔“ میگر ز آرٹ چوزرز،“ مغلقتے کس منہ سے چناو کریں۔“

”اے بے فکر نہ کر۔“ بابا چلاتا۔ ”خود آجائیں گی ایک نہ ایک روز۔“  
”نی الحال خطہ ہی صحیح دیں۔“ شام چلاتا۔

”جو خط آگیا تو مصیبت پڑ جائے۔ جی کے شور مچاتا۔ پر ماتما کے لئے مصیبت  
پڑ جائے۔ جلدی پڑے،“ شام کہتا۔ اس خیریت ہی خیرت سے تم ہم تک آگئے در  
ہے کسی روز زہر نہ کھالوں۔“

”زہر خریدنے جاؤ گے تو مجھے بتا دینا۔“ ایلی کہتا۔

”تو لو بتائے دینے میں“ شام ہستا۔

”کیا مطلب جاری ہے زہر خریدنے۔“ ایلی پوچھتا۔

”شمیں خرید کچے ہیں۔“

”کونی والی ہے۔“

”پونا شیم سانائیڈ۔ لبارٹری سے اٹاں ہے بڑی مشکل سے جس روز موڑ خراب  
ہوڑنک کھول کر کپڑے تک نہیں بدلتا۔“

”کیوں؟“

”ڈرتا ہوں کہیں کھانے لوں۔“ شام مسکرا کر کہتا لیکن اس کی مسکراہٹ میں بخیدگی  
جھلکتی۔

”وہ کیسے؟“

”وہیں کپڑوں کے ساتھ ڈرنک میں رکھی ہے نا اس لئے ڈرنک نہیں کھولتا۔“

”ڈر کیوں کو معلوم ہے کہ تمہارے ارادے خطرناک ہیں۔“ جی کے ہستا۔

”اے یار اتنے دوست ہیں لیکن کوئی نہیں بتاتا انہیں۔“ جکل سچا دوست کہاں  
ملتا ہے۔“

”تو میں بتا دوں۔“ بابا کہتا۔

”لوسن لو نیکی اور پوچھ پوچھ۔“ شام چلاتا۔

”کس کو بتاؤ؟“

”باری باری سب کو بتاؤ،“ ممکن ہے کسی کا دل پسج جائے۔ ”شام بنجیدگی سے کہتا۔

شام کی باتوں سے یہ محسوس نہ ہوتا تھا کہ وہ دکھاوے کی بات کر رہا ہے۔ یا اُنگیں گفتگو کی نمائش کر رہا ہے۔ اس کے انداز میں ایک عجیب قسم کی عجز اور خلوص تھا جو ایلی کو بعد پیارا لگتا تھا۔

ایلی کو پڑھتے دیکھو شام جی کے کی طرح طنز نہیں کرتا تھا اس کے رعناس وہ حیرت سے دیکھتا اور لکھتا۔ ”یا ر تم اتنی بڑی بڑی آتا ہیں پڑھتے جا رہے ہو اور یا ر لوگ اس پاکٹ بک میں کھوئے ہوئے ہیں۔“

”کون ہی پاکٹ بک۔“ ایلی پوچھتا۔

”وہی لڑکیاں اور کون۔“

”کون ہی لڑکی۔“

”کوئی سی۔ آج ایک نے رحم کھا کر اٹھانے کے لئے کوٹ دے دیا مجھے جب سے نشہ ساطاری ہے۔ طبیعت اتنی خوش ہے کہ جو مانگو گے ملے گا۔ جو کہو منظور۔ کہو تو نک شاپ سے کیک بخلا دوں۔“ وہ اپنے جیب ٹھولتا۔ ”لوپور اسورو پیسے ہے کھالو جو کھانا ہے آج ورنہ پچھتاوے گے۔ ایسے شہر مے موقع روزہ بھین ملتے۔“

والدہ قسم کی لڑکیوں کے متعلق جی کے شام سے پوچھتا۔ ”یا ر تم ہمیں ان سے گھن نہیں آتی۔“

شام منہ بننا کر جواب دیتا۔ ”بے حد،“ اس کے انداز سے سخت نفرت کا اظہار ہوتا ”نفرت تو آتی ہے اور جب وہ لڑکیوں کی طرح چونچلے کرتی ہیں تو جی چاہتا ہے کہ منہ پر یہ تھپڑ دوں۔“ شام جوش میں آ کر تھپڑ چلاتا

”ہوں۔۔۔ یہ“  
”ہےنا۔۔۔ جی کہ کہتا۔

”بالکل“ شام جواب دیتا۔ ”میرا تو اور بھی جی چاہتا ہے۔“

”کیا؟“

”یہ پھر ووں۔۔۔ شام پھر بازو ہوا میں زور سے گھما تا۔۔۔ پھر فقطاً اپنی اس حرکت پر اس قدر ندامت محسوس کروں کہ اس کے قدموں میں گر جاؤں اور پھر وہ مجھے اٹھا کر گود میں بٹھالے اور پھر لوری دے لے سلا دے۔ یار مجھے زندگی میں کبھی کسی نے لوری دے کر نہیں سلا یا۔۔۔ ماتا جی تو بالن میں ہی چھوڑ کر چلی گئیں تھیں۔“

شام کا بات کرنے کا انداز پچھایا تھا کہ اس کی بات پرانکتہ چینی کا سوا ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ سچ کہہ دیتا تھا۔ حالانکہ سچ کی نوعیت اس قسم کی ہوتی تھی کہ اسے کہہ دینے میں بے حد جرأت کی ضرورت ہوتی ایسی بھی چاہتا تھا کہ وہ پچھی بات کہہ دے لیکن اس میں کبھی جرأت پیدا نہ ہوئی وہ ڈرتا تھا کہ لوگ کیا سمجھیں گے وہ ڈرتا تھا کہ لوگ اسے اخلاق سے گرا ہوا سمجھیں گے۔ لیکن شام جب بھی اس قسم کی بات کرتا تو اس طرح سے اسے ادا کرتا جیسے اس میں ڈرنے والوں کے دلوں میں نفرت احتیاج یا کچھ اور پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسی چاہتا تھا کہ وہ شام کی طرح باقی میں کر سکے۔ پچھی باتیں جن میں رنگینی اس قدر غالب ہوتی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں کوئی اور رد عمل پیدا نہیں ہونے دیتیں۔ لیکن ایسی کی یہ خواہش خالی خواہش ہی رہی اور اس میں اتنی جرأت نہ پیدا ہو سکی کہ اس پر عمل کر سکے۔

## رائے

شام کے علاوہ اور لڑکے بھی تھے مثلا جان تھا۔ لیکن وہ تو گونگا تھا۔ بات سن کر نہ دینے کے علاوہ اس نے کبھی کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ ان سب میں بیٹھ جاتا بیٹھا رہتا۔ ان کی باتیں سنتا رہتا اور مسکراتا رہتا۔ اس نے کبھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔

پھر رائے تھا ایک جذباتی لڑکا تھا کئی ایک باتوں میں تو وہ جمال سے بہت ملتا جلتا تھا مثلاً اپنی محبتیوں اور محبوبوں کی باتیں سنانے کے لئے اسے ایک رازدار کی اشد ضرورت تھی ضروری نہ تھا کہ رازدار قابل اعتماد ہو یا اچھا مشورہ دے سکے یا کچھ اور جہاں تک رائے کا تعلق تھا رازدار کے چنانچہ کی چند ایں ضرورت نہ تھیں چونکہ اسے صرف ایک ایسے فرد کی ضرورت تھی جو اس کی باتیں سنتا رہے۔ لُو کے نہیں ایسا مشورہ نہ دے جو اسے قبول نہ ہو۔ جب وہ حماقت کرنے ہر تباہ بٹھا ہو تو عقل کی بات بتا کر اسے روشنی کی کوشش نہ کرے بلکہ جما تقویں میں اسے شہر دے۔ اس لڑکی کو جسے وہ حسین سمجھتا تھا عام اسری نہ سمجھے بلکہ اسے انہیت دے اور اس میں وہ خوبیاں دیکھے جو بظاہر بالکل دکھائی نہیں دیتی ہوں۔ غرضیکدا اسے ایک سامع رازدار کی ضرورت تھی۔ اور اس روں کے لئے ایلی بے حد موزوں تھا اس لئے رائے اسے اپنے تازہ ترین کارنامے سناتا رہتا تھا۔

ایلی نے کبھی غور سے رائے کی بات نہ سئی تھی اگر چوہا اس انداز سے سنتا تھا جیسے واقعی بڑے غور اور انہاک سے سن رہا ہو۔

بہر حال رائے کے قصے ایلی نے کبھی نہ سنتا تھا اس کے باوجود واسطے ان کے متعلق چند ایک باتوں کا دھندا احساس تھا مثلاً رائے کی ایک محبوبہ گاؤں میں رہتی تھی اور وہ اسے ملنے کے لئے شدت سے بے قرار تھی۔ اور ہر پندرھویں روز اسے گاؤں بلا بھیجتی اور اگر چہ کے والدین کو اس کا رائے سے ملنا قطعی طور پر ناگوار تھا تاہم وہ رائے کے الفاظ سے اس قدر بول دتی کہ اسے اپنے گھر ٹھہراتی اور پھر رات کے اندر ہیرے میں چپکے سے ملتی۔ اس پر بولڑی ماں شدت غم سے پہلو بدلتی۔ باپ احتجاج کے طور پر بار بار کھانتا لیکن وہ بڑی بولڈڑ کی تھی اور اس کی اس بولڈڑس کی وجہ سے رائے کو اس سے والہانہ محبت تھی رائے کی دوسرا محبوبہ شہر میں رہتی تھی۔ مشن

سکول میں استانی تھی اور اتنی قبول صورت اور اڑو انسدھی کہ سمجھی کے چیلز نوجوان جو گردوںواح میں رہتے تھے اس پر ہزار جان سے عاشق تھے اسے راہ چلتے چھڑتے تھے لیکن رائے کے سوا اسے کوئی پسند نہ تھا چونکہ اسے رائے سے محبت تھی۔

رائے کی تیسری محبوبہ لاہور ہی میں تھی وہ بے حد معصوم اور خوبصورت تھی۔ اتنی معصوم تھی کہ ان دونوں ایک بد معاش لڑکے نے اسے قابو میں کر رکھا تھا۔ اور وہ بیچاری ان جانے سیدھی راہ سے بھٹک گئی تھی بہر صورت رائے جانتا تھا کہ وہ دن دو ر نہیں جب وہ سمجھ جائے گی کہ وہ بد معاش نوجوان محض اپنا مطلب پورا کر رہا ہے اور پھر وہ ایک نئے شوق اور تازہ عزم سے رائے کی طرف لوئے گی اور ان کا رومن پھر سے تازہ ہو جائے گا ان دونوں رائے کی سب سے بڑی خواہش یہ نہ تھی کہ گاؤں والی محبوبہ اسے بلائے یا شہروالی محبوبہ کو نوجوان وقت کرنا چھوڑ دیں یا لاہور والی محبوبہ کی آنکھیں کھل جائیں۔

ان دونوں تو اس کی صرف یہ خواہش تھی کہ کالج کی ان چھٹیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کا رومن ہل پڑے اور اسے ہر ماہ دوبار اتنی دور گاؤں تک سفر نہ کرنا پڑے۔

اس سلطے میں وہ اکثر ایلی سے مشورہ طلب کیا کرتا تھا۔

”یا راہیل کوئی ایسی تجویز بتاؤ کہ اپنی بات بن جائے۔“

اور اگر ایلی جواب دیتا۔ ”لو۔ اس میں کیا ہے جا کر کسی کا ہاتھ پکڑ لو۔“

”اور اس نے تھپٹر مار دیا تو۔“

”تھپٹر مار دیا تو سمجھ لو بات پکی ہو گئی۔“ ایلی کہتا۔ ”ایک پرس کا یہی فیصلہ ہے۔“

”کیسے؟“

”سیدھی بات ہے اگر ہاتھ چھوڑ دیا تو سمجھو بات ٹوٹ گئی۔ پکڑے رکھا تو تعلقات تمام ہو گئے اور اگر جرات کر کے اسی وقت آغوش میں لے لو تو ہمیشہ کے

لئے اس کے دل میں دماغ پر مسلط ہو جاؤ گے۔“

”یہ تو صحیک ہے۔“ رائے جواب دیتا۔ ”لیکن کبھی یا را کیلے میں کوئی ملے تو بات  
بنے۔ اسی کوشش میں لگا تھا کہ کبھی اکیلے میں کوئی مل جائے۔“

ویسے ایلی کوئی مرتبہ وہ اکیلے میں ملتی تھیں لیکن ایلی نے کبھی ہاتھ تھامنے کی کوشش  
نہ کی تھی۔ ہاتھ تھامنا چھوڑ اس وقت نہ جانے کیا ہو جاتا تھا۔ دور سے کوئی  
اکیلی چلی آتی دکھانی دیتی تو ایلی کا دل دھک سے رہ جاتا جیسے لڑکی نہیں جگاڑا کو آرہا  
ہو۔ اس کا جی چاہتا کہ کوئی لڑکا آجائے تاکہ اسے حوصلہ ہو۔ اس کا جی چاہتا کہ مرد کر  
بھاگ لے نہیں نہیں وہ سوچتا یہ ٹھیک نہیں لیا ہے گی وہ۔ مجھ تھوڑیوں گزر جانا چاہئے  
جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ آخر بات لیا ہے ایک لڑکی گزر رہی ہے اور کیا اور لڑکی کبھی وہ  
جو مجھے قطعی پسند نہیں۔ پھر گھبراہٹ تیسی۔ وہ گردن انداز کر یوں چلنے لگتا جیسے کوئی بات  
ہی نہ ہو۔ لیکن جب وہ لڑکی کے قریب پہنچتا تو اس گردن جھک جاتی۔ نگاہیں کوئے  
تلاش کرنے لگتیں اور دل بیٹھ جاتا پسینے چھوٹ جاتے۔

لیکن ایلی کی بات چھوڑ دیئے اسے تو ان چھوڑ کیوں میں چند اس دلچسپی نہ تھی اور  
ایسی لڑکیوں سے رومان کیسے قائم کیا جا سکتا ہے بھلا۔ جنہیں انسان جب جی چاہے  
جا کر مل سکے۔ ان حالات میں محبت کا پیدا ہونا ایلی کی دانست میں ناممکن تھا۔

ایلی کی دانست میں محبت کے لیے ضروری تھا کہ بند شیں ہوں قیود ہوں۔  
پردے اور دیواریں حائل ہوں۔ بر قعہ ہو گونگھٹ ہو۔ نگاہ تر چھپی۔ مسکراہٹ زیر  
لبی ہو۔ دور سے اشارے ہوں۔ ساتھی سے مکھی اڑانے کے بہانے سلام کیا جائے  
لو یہاں لکھے جائیں۔ اور یہ کیا ہوا ہیلو مس بینا کہنے مزاج کیسے ہیں۔ لا حول ولا قوۃ۔

لڑکیوں کے بارے میں ایلی کو شام کا طرز عمل بے حد پسند تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا  
کہ کسی روز کسی لڑکی سے اکیلے میں ملے اور کہے جسٹ اے منٹ مس یہ تو بتائیے کہ  
بھلا آپ کو دیکھ کر دل میں کچھ کچھ کیوں ہونے لگتا ہے۔ گردن کیوں لٹک جاتی

ہے۔ نگاہیں کونے کیوں تلاش کرتی ہیں اور اگر وہ جواب میں تھپٹر مار دے تو اس کا ہاتھ پکڑنے کی بجائے جھٹ جیب سے پچھرا اور روئی نکالے اور کہے اب ایک تکلیف اور کچھ ذرا چوت پچھر لگا وہ بجھے مجھے جگہ دکھتی نہیں۔

اسفند

شام سے دلچسپی کی ایک وجہ اور بھی تھی دونوں گواہنہ دیا رے بغضہ تھا۔ اسفند نہایت خلیقِ محنتی ملنے سارا اور فیضین لڑکا تھا۔ وہ کسی نہ ل سکول کا ہمیں مانٹر تھا اور ریفریشر کورس کے لئے بیٹی کلاس میں داخل ہوا تھا۔ وہ راہ چلتے لڑکے کو روک لیتا۔ ”کہاں جا رہے ہو بھائی کتنے وقت کیسے گزرتا ہے۔“ اور اس کے قریب تر ہو جاتا اور قریب حتیٰ کہ آپ محسوس کرتے کہ ابھی وہ آپ سے بغل یہر ہو کر آپ کا منہ چوم لے گا۔ اور اس طرح ہمیشہ کے لئے آپ کا دوست بن جائے گا۔

وہ السلام علیکم کہہ کر جی کے کمرے میں آپنچتا۔ ”بھائی تم ملتے ہی نہیں کئی مرتبہ آپ کا ہوں نہ جانے کہاں گم رہتے ہو تم دونوں۔ یا روہ ایک مشکل آن پڑی تھی۔ میں نے کہا کسی حسابی سے جا کر پوچھوں اپنے کو تو حساب میں کوئی دلچسپی نہیں۔ یہاں اے بی کورس والے تو صرف تم ہونا۔“

شام کی ڈار میٹی میں جا کر وہ شام سے پوچھتا۔ بھی وہ پیچگ آف کمسنی نہیں ملتی کوئی اتنا پتہ یا رہتا اور کچھ ہم بھی پڑھ لیں پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک زمانے کے بعد پھر پڑھنے کے چکر میں پڑھ گئے اب عادت بنتے بنتے بنے گی۔“

اسفند ہر ایک سے ملتا تھا۔ بڑے پیار سے ملتا تھا۔ پیا کا اظہار کرتا تھا۔ اپنی ڈنی کم مائیگی کا اظہار بھی کرتا تھا محبت بھری نگاہیں بھی ڈالتا۔ قریب تر ہو کر اپنا بازو آپ کے شانے پر رکھ دیتا۔ یا آپ کا بازو اپنی بغل میں ڈال لیتا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں کسی اصول کے تحت اسے لوگ بور سمجھتے تھے بور کا فقط تو خیر اس زمانے میں رانج نہ تھا لیکن اڑکے اس سے کافی کترانے تھے۔ اس کی مٹھاں کثیف محسوس ہوتی

اس کا قرب کھلتا ایسے محسوس ہوتا جیسے ایک زم زم لیس دار چیز آپ سے چھٹی جا رہی

نہ جانے قدرت کے کس قانون کے تحت اسفند کے آتے ہی دفعتا یاد آیا کہ آپ کو ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔ اسے دیکھ کر آپ اپنا پروگرام بدل دیتے کسی اور سمت کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیتے۔

شاید اس کی وجہ پر کیاں ہوں؟

اسفند سب سے بڑا گولہ بردار تھا وہ ہر وقت اڑ کیوں کے جھرمٹ میں رہتا ہو وقت ان کا طواف کرتا۔ چاہیے وہ واضح طور پر اس امر کا اظہار کرتیں۔ موڈ آف ہے آپ جائیں۔ چاہیے ان کا ساتھ منہ موڑ لیتا یا پوچھ لیتا۔ کیوں اس فند صاحب آپ لا بیری کو جا رہے ہیں نہ، لیکن اس فند اپنی جگہ سے نہ ہلتا اور ہزار طنز کے باوجود اس کے ہونٹوں پر وہ لیسدار مسکراہٹ چپکی رہتی۔ اس کی طبعی مٹھاس جوں کی توں تمام رہتی اخلاق بدستور خوش گوار رہتا اس کی باقی جاری اور ساری رہتیں حالا کہ باقی لوگ وضاحت سے اس امر کا اظہار کر چکے ہوتے کہ محفل میں گنجائش نہیں لیکن اس فند کا رو یہ یہ ظاہر کرتا کہ وہ اپنے پیارے دوستوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا وہ بے وفا نہیں۔ چاہیے اس کا اپنا حرج ہی کیوں نہ وہ آداب محفل کو نظر انداز کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اگر کوئی اڑ کا اڑ کیوں کو آس کریم کھانے کی دعوت دیتا تو اکثر وہ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا کہ اس فند تو آس کریم کھاتا ہی نہیں۔

مگر اس فند فوراً بولتا ”کھاتا تو نہیں لیکن تمہارے جیسا پیارا دوست کہے تو انکار نہیں کروں گا۔“

دعوت سے زبردستی چھٹے رہنے کی خصوصیت چھوڑ دیئے اس سلسلے میں تو اس فند اس حد تک فراخ دل تھا کہ خود لوگوں کو دعوت دیتا۔ لیک شاپ پر میز بان بن کر سب کو

کھلاتا اور پھر چپکے سے لگ شاپ والے سے کہہ دیتا۔

”میاں یہ بل شام یا مونا ادا کرے گا۔“ ویسے کسی دوسروے کی دعوت میں بھی اسفند کا رو یہ کچھ ایسا ہوتا اور وہ انہاک اور شوق سے لوگوں کو کھلاتا تاکہ ہر کسی کے دل میں احساس پیدا ہو جاتا تاکہ دعوت اسفند کی طرف سے تھی۔

ان ہی باتوں کی وجہ سے لوگ اسفند سے گھبرا تے تھے لیکن ان باتوں کی وجہ سے تو صرف ان لڑکوں کو گھبرا ناچاہئے تھا جو لڑکیوں کے حلقے میں رہتے تھے۔ وہ لڑکے جنہیں لڑکیوں کے حلقے سے دور کا تعلق بھی نہ تھا انہیں گھبرا نہ کیا ضرورت تھی۔ لیکن اسفند کے مختلف ان ڈکے جذبے بھی اس تم کے تھے اور یہ دباؤ اس قدر عالم ہو چکی تھی کہ ایک روز ہنگامہ ہو گیا۔ ہوشیاری سے صدر دروازے سے باہر بر گدکے درخت کے نیچے وسیع میدا میں شور ثیر آبے کی آوازیں سنی گئیں۔ تمام لڑکے بورڈنگ سے باہر نکلی آئے اور کالج سے بھی لڑکے آموجو ہوئے بر گدکے نیچے ”لڑکے آپس میں لڑ رہے تھے۔ لڑائی نے ہاتھا پالی کی صورت اختیار کی تھی۔ دونوں بڑے غصے سے چیخ رہے تھے۔

”اے بہٹ بے بڑا آیا ہے کبھیں سے۔ میرے روپروتیری وال نہیں گل سکتی۔ تو میری مینگلی سے واقف نہیں شکل و صورت تو دیکھا پنی بھگوان کی سو گند جیسے چھپکی ہو۔“

”اے جا۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔“

اس طرح دیر تک وہ چلا تے رہے۔

”بات کیا ہے بات کیا ہے۔“ لڑکوں نے چاروں طرف سے شور مچا دیا۔ بورڈنگ اور کالج میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ لڑکے بھاگے بھاگے آپنچے۔

چاروں طرف خبر مشہور ہو گئی کہ بر گد تلے جھگڑا ہو رہا ہے۔ ایک لڑکا کہتا ہے میں کمینہ ہوں دوسرا کہتا ہے کہ تیری کیا حیثیت ہے اپنے سامنے۔ میں بہت بڑا کمینہ ہوں۔ عجیب جھگڑا تھا۔ لہذا سب بر گدکے درخت کی طرف بھاگے جتی کہ پروفیسر

اور چھڑ کیاں بھی آپنچیں۔

دونوں لڑکے بڑی شدت سے چلا رہے تھے منہ سے کف جاری تھا آستینیں لٹکی ہوئی تھیں جیسے ابھی ہاتھ پالی کی نوبت آجائے گی۔

”میں کہتا ہوں میں مکینہ ہوں“، ایک چیخ رہا تھا۔

”ابے جا۔“ دوسرا لہر رہا تھا۔ ”تو کیا تیری اوقات کیا ہے۔“

جب سے لڑکوں نے جھڑے کا انداز دیکھا تو چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ لڑکے فوراً تازگے کہ یہ جھڑا نہیں کچھ اور ہے نہ جانے مداری کے پثارے سے کیا سانپ نکلا۔

دیر تک چیخ چیخ جاری رہی۔ حتیٰ کہ سب لکیاں آپنچیں پروفیسر بھگت سنگھ بھی آگئے۔ لالہ جی تو دور سے تماشہ دیکھتے رہے لیکن پروفیسر بھگت سنگھ بڑے سادہ لوچ اور مخلص تھے وہ گھبرا گئے انہوں نے بچاؤ کرانے کی کوششیں کیں۔

عین اس وقت دونوں لڑکوں نے جھڑے کا نقطہ روچ پیدا کر دیا۔

ایک بولا۔ ”ابے کمینگی میں میں تیرا باپ ہوں۔“

”بے جا۔“ دوسرا چلایا۔ گلیکو بے بی تو دیکھو۔ ”جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش ہے اور آیا ہے ہم سے مقابلہ کرنے ابے میں تیرے باپ کا باپ ہوں وہ کمنہ ہوں میں۔

”میں خالی مکینہ نہیں ذمیل بھی ہوں۔“

”کس قدر ذمیل ہوتم“ دوسرا نے غصے سے پوچھا۔ ”میں پہلا بولا“ میں پروفیسر بھگت سنگھ کا جوٹھا کھا سکتا ہوں۔“

”ابے بس۔“ دوسرا چلایا۔ ”ابے میں کتنے کا جوٹھا کھا سکتا ہوں۔“

پہلا بولا۔ ”میں اسفند کا جوٹھا کھا سکتا ہوں۔“

دوسرا خاموش ہو گیا۔ ”بھی میں اسفند کا جوٹھا نہیں کھا سکتا۔ میں ہار گیا ہار

گیا۔“

چاروں طرف سے قہقہوں کا شور اٹھا۔

دولڑکوں نے بڑھ کر پہلے لڑکے کو شانوں پر اٹھایا۔ اور اسے لے بھاگے جیت گیا!! جیت گیا!! جیت گیا!! اور چلا رہے تھے اس سے بڑی ذلت نہیں ہو سکتی زندہ با دشام زندہ با دشام۔

”اے، ایلی حیرت سے چلایا۔“ یہ دشام ہے۔“

اُدھر اسفند بھر مسکرا رہا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے شام نے اس کا نام ہبینہ لیا ہو۔ اور لیا بھی ہو تو شخص مذاق اور تفریح کے طور پر لیا ہو۔

لیکن بھگت سنگھ چلاتے جا رہے تھے تا لاقتوں نے میرا نام خواہ مخواہ لے دیا ارے میں تو گروکا پیارا ہوں۔ مجھے کیوں حصیٹے ہو اپنے بھڑوں میں۔“

پھر شام پچکے سے ایلی کے کان میں کہہ رہا تھا۔ ”وہ بچھاڑا ہے آج کے سال بھی اٹھنے سکے گا۔“ اور اسفند یوں دیکھ رہا تھا جیسے پوچھر رہا ہو۔ کسے بھائی؟۔

اس روز رات کو بورڈنگ میں بہت ہنگامہ ہوا۔ ہر ڈارمیٹری میں لڑکے اس ڈرامے کو دھرا رہے تھے جو اس شام بر گد کے درخت کے نیچے شام نے کھیا تھا۔ ”میں کمیونی ہوں۔“ ایک ڈارمیٹری سے آواز آتی۔ ”ابے تیری کیا ہمت ہے جو ہمارے ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کرے۔“ دوسری ڈارمیٹری سے کوئی چلاتا۔ ”ابے جا بے،“ تیسی ڈارمیٹری سے شور بلند ہوتا۔ اور پھر بارے میں کھڑے لالہ جی مسکرا رہے تھے ”میں کہتا ہوں بھی۔“ وہ کہہ رہے تھے ”اس بات کا تو فیصلہ شام کو ہو چکا اب کوئی اور دعویٰ کرو۔“

ڈائینگ ہال میں کوئی روم میں لان میں ہر جگہ لڑکے با تین کر رہے تھے۔

”یار شام نے وہ مار دی ہے وہ مار دی ہے اس فند کو کہ چاروں شانے چت گریا ہے۔“

”اے لڑکیوں کو دیکھا تھا مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔“

”اب اسند کا لڑکیوں پر جادو نہیں چلے گا۔“

”اوہ جوں“ اندر شام کہہ رہا تھا ”یا اپنی محنت بیکار گئی۔ اسند پر تو کوئی اثر ہی نہیں ہوا مجھ سے پوچھ رہا تھا یا مریٹ برائی کسی بات پر تھی اپنی سمجھ میں نہیں آیا کچھ۔ اب بتاؤ ایسے آدمی سے کوئی کیا گرے۔“

”اے نہیں یار نہتا ہے۔“ ایک نے جواب دیا۔

”ہاں اندر سے تو شکنا چور جو کیا ہے۔“

”نہ چکنا چور نہیں۔“ دوسرا بولا ”بھی وہ تو مٹی کا پہلوان ہے ادھر گرایا ادھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔“

”بھگوان جانے ٹھیک کہتے ہو، شام ہٹنے کا“ مٹی کے پہلوان کوون گرا سکتا ہے۔ چلو آج سے ہم نے اسے بخش دیا۔ معاف کرو یا۔“

شام کے اس اعلان پر ہوٹل کے سب لڑکے تملماٹھے۔ چاروں طرف شوریج گیا۔

”اے یار سناتم نے اتنی بڑی فتح حاصل کرنے کے بعد شام اسند سے ہار گیا۔“

”نہیں یار اسند نہیں ہار سکتا۔“

”جا کر پوچھ لو۔“

لڑکے شام کے پاس آئے۔ لڑکوں کو اس کا بہت غم تھا اسند کو پچھاڑنے کے لئے شام ان کا واحد پہلوان تھا۔ اگر اس نے بھی میدان چھوڑ دیا تو ہو گا کیا۔ یہ خیال ان کے لئے سوہان روح ہو رہا تھا۔ کبھی چاہتے تھے کہ اسند کے ساتھ جنگ جاری رہے اگرچہ کسی کو بھی علم نہ تھا کہ وہ اسند کے خلاف کیوں تھے۔ اسند نے کبھی کسی لڑکے کوشکائیت کا موقع نہیں دیا تھا اس کے باوجود اسند ایک ایسا پلپلا کیڑا تھا کہ ہر

لڑکے کا جی چاہتا تھا کہ پاؤں سے مسل وے۔

جی کے کی ناک پر ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ”لہذا“ وہ چلا رہا تھا۔ ”یہ سب کیا ہے کیا ہے یہ دھکا اور کیا مقصد یہ ہے کہ لڑکیوں پر اثر ڈالا جائے۔“

ایلی کا موش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”خالی۔ ایکریز بیشن خالی کیون غلط ہے۔“ اس نے ایلی کو مغلاب کر کے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”بڑا پد معاشر ہے یہ شام لڑکیوں کے دل میں اپنی جگہ بنا رہا ہے۔“

عین اس وقت کامانوں کا روشنی خل ہوا۔

”کیوں گامے کیا بات ہے۔“ جی کے نے پوچھا۔

### اندر مہاراج

”جی۔ جی وہ“ گامابولا ”شام بايو نے حلوہ بھیجا ہے کہتے ہیں گاؤں سے آیا ہے۔“

”حلوہ دکھاؤ نا۔ ارے یہ تو گاجر کا ہے۔“ جی کے پلیٹ کو دیکھ کر چلایا حلوے کو دیکھ کر اس کی ناک سکڑ کر اپنی جگہ پر آگئی۔ ”اچھا“ وہ بولا ”جا کر شام بايو سے کہو، ہم نے تمہاری سب خطائیں معاف کر دیں۔“

”کیا کر دیں۔“ گامابو پھختے لگا۔

”لڑکیوں کو خوش کرنے کے لئے جو تماشہ کھیلا ہے۔ شام نے۔“ جی کے نے وضاحت کی۔

”ا جی جو تماشہ پچھلے سال ہوا تھا اس کا تو جواب نہیں۔“

”ہائیں“ جی کے نے حیرت سے گامے کی طرف دیکھا۔

”اوہہوں“ گاماسکرا کر بولا ”جی یہ تو کچھ بھی نہیں۔ جی پچھلے سال ایک بايو تھے ایس بی میں انہوں نے توحد کر دی تھی۔ سات کی سات لڑکیوں کو ساتھ لئے پھرتے

تھے بس سمجھ لواند رہا راج تھے وہ اپنے وقت کے

”ساتھ لئے پھرتے تھے سات کی سات“ ایلی نے حیرت سے دہرا�ا۔

”جی“ گامبولا۔ ”کانچ والوں نے ہمکیاں دیں لالہ جی نے کھائکال دیں گے بورڈنگ سے پرنسپل نے لکھ کر بھیج دیا کہ کانچ کے نام کاٹ دو پر اس پڑھنے نے جرا پرداہ نہ کی۔ اور خدا جھوٹ نہ بلائے بابو جی۔ ہر رونج رائے کے وقت وہ یہاں آ جاتی تھیں۔ سب لڑکیاں بورڈنگ کے باہر والے لان میں اور بابو جی دیور پھلانگ کر باہر نکل جاتے تھے لان میں۔ پھر وہ آدمی آدمی بات تک وہاں گھوٹتے رہتے تھے۔ سب کو معلوم ہوتا کہ وہ کانچ کے لان میں گھوم رہے ہیں لالہ جی کو بھی پہنچ ہوتا پھر جب وہ دیوار پھلانگ کرو آپس آتے تو لالہ جی پوچھتے چوٹ تو نہیں لگی اور وہ ہن کر جواب دیتے لالہ جی میری الماری میں پتھر کھلی ہوئی ہے۔ لگلوں گا تو ٹھیک ہو جائے گی یہی حالت تھی۔“ گامہنے لگا۔

گامبا تمیں کر رہا تھا تو ام کے داخل ہوا۔

”اے تم“ جی کے چلایا ”تم کہاں۔ اور تم بورڈنگ کے افر کیسے آ گئے۔؟“

ام کے ہٹنے لگا ”دیکھ لو۔“ وہ بولا پھر گامے کو دیکھ کر اس سے مخاطب ہوا۔

”کیوں بھی گامے کیا حال چال ہے۔“

گامے کی آنکھوں میں عجیب ساتھیم چھلک رہا تھا۔ اچھا ہوں بابو جی بڑی مہربانی ہے۔ اور بابو جی بڑی عمر پ کی ابھی آپ ہی کی ابھی آپ ہی کی بات کر رہا تھا۔“

”آپ ہی کی بات“ جی کے نے حیرت سے گامے کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں“ گامبولا ”تم وہ رستم زمان ہو۔“

”دیکھ لو“ ام کے ہٹنے لگا۔

”بالکل بکواس جھوٹ“ جی کے بولا ”تمہیں تو بات کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا

تھا۔“

”اب بھی نہیں آتا۔“ وہ بولا۔  
”تو پھر۔“

”صرف بانہہ پکڑنے کا ڈھنگ آتا ہے۔“ ام کے ہٹنے لگا۔

”اکٹھی سات بانیں۔“ ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں“ ام کے بولا۔ ”میں تو ایک ہی پکڑتا تھا باقی چھمیری بانہہ پکڑتی تھیں  
”اور قہقهہ مار کر ہٹنے لگا۔“

”اچھا تو یہ آپ کے بھی دوست ہیں۔“ لالہ جی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے  
بولے پھر ام کے سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ”ہبھی آج کل گھاہ ہو۔ کیا بھی قصور  
ہی میں ہو۔“

”جی ہاں“ اس نے جواب دیا۔ ”میکن وہ مجھے سپنڈ کرنے والے ہیں۔“  
”کیوں وہاں بھی کیا لڑ کیوں کا قصہ ہے؟“ لالہ جی نہیں۔  
”نہیں لالہ جی۔“

”تو پھر کیوں؟“

”ویسے ہی جلتے ہیں۔“ ام کے ہٹنے لگا۔ ”شہر تو ہوں گی ناٹر کیاں“ جی کے نے  
لالہ جی سے کہا۔

”شہر میں تو وہ وہ چیز ہے کہ لالہ جی کیا بتاؤں؟ طوفان بپا ہے۔“

”کیا رات بیٹھیں رہنے کا ارادہ ہے۔“ لئے پوچھا۔

”نہیں لالہ جی۔“ ام کے بولا ”ابتدہ چاہتا ہے کہ پھر سے کانج میں داخل ہو  
جاوں۔“

”تو ہو جاؤ۔“ لالہ جی بولے۔

”کر لیں گے آپ،“ ام کے ہٹنے لگا۔

لالہ جی کے جانے بعد کچھ دری وہ باتیں کرتے رہے پھر ام کے تیار ہو گیا۔

”اچھا یار میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام ہے پھر آؤں گا۔ اب تو آتا ہی رہوں گا۔“

پھر ایلی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ”چلو یا ردرا کچھ دیر میرے ساتھ چلو پھر واپس آ جانا۔“

### زنانہ ہو ٹھل

دیر تک ایم کے اور ایلی لا ہور کی ویران سڑکوں پر چلتے رہتے۔ ایک دو مرتبہ ایلی نے کہا مجھے اب جانے دو یا اس لیکن ام کے نے بس حموڑی ہی دور اور کہہ کر اسے مطمئن کر دیا۔ پھر وہ لڑکیوں کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ اور ایلی کو خیال ہی نہ رہا کہ اسے واپس جانا ہے اور ناماوس علاقے میں ہوا تھی دور انکل آیا ہے کہ واپس بورڈنگ میں پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔ ام کے اسے ٹریننگ کالج میں لڑکیوں سے متعلق کارنامے سنارہا تھا۔

ایک وسیع کوٹھی کے سامنے ام کے رک گیا۔ کوٹھی کے چاروں طرف قد آدم دیوار بنی ہوئی تھی۔ اور سڑک کی جانب ایک بہت بڑا دروازہ تھا۔

”ایک بات مانو گے“ اس نے ایلی سے کہا ”اگر تم صرف پندرہ منٹ یہاں میرا انتظار کرو تو میں اپنے دوست سے مل کر واپس آ جاؤں گا پھر ہم اکٹھے واپس جائیں گے تم بورڈنگ چلے جانا اور میں بھائی دروازے چلا جوں گا۔“

اس وقت آدمی رات ہو چکی تھی ایلی اس ویران جگہ انتظار کرنے کے لئے تیار نہ تھا لیکن اسے واپسی کے راستے کا بھی تو علم نہ تھا۔ اس لئے مجبوری میں اس نے ام کے کی بات مان لی۔ اور بڑے دروازے کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

دیر تک ایلی وہاں بیٹھا رہا پھر وہ گھبرا کر شہلنے لگا۔ ام کے کو گئے تقریباً آدھے گھنٹے ہو چکا تھا۔ دور کسی گھڑی نے ساڑھے بارہ بجائے۔ اسے سمجھے میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے شہلنے شہلنے تھک کروہ بیٹھ گیا۔

دفعاً مکان کے اندر سے شور اٹھا۔ لوگ دوڑ رہے تھے۔ کون ہے؟ کون ہے؟ کیا

ہے؟

دواںکے عورتیں چیخ رہی تھیں۔ ایلی وہ آوازیں سن کر چونکا پھر اس نے سمجھا شاید کوئی بات ہو، ہوگی کوئی بات۔ پھر قریب آئی لوگ چل پھر رہے تھے تھک لگ لگ جیسے کوئی اوپھی ایڈیاں فرش پر مار رہا ہو۔

پھر درہرام نے صدر دروازہ کھل گیا۔ کچھ لوگ لاشین اخھائے باہر کل آئے۔ ایلی بیٹھے بیٹھے چپ چاپ ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نہ جانتے کون ہیں یہ لوگ۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ایک نوجوان ہاتھ میں لٹھ سنجھا لے دہراتے میں لاشین پڑے اس کے قریب آگیا اس کے پیچھے دو مرد تھے اور ایک اور یہ عمر کی شیم تھی۔

”کون ہوتم۔“ اس نے درست لمحے میں پوچھا۔

”میں ہوں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”یہاں کیوں بیٹھے ہو۔“

”تھک گیا تھا بیٹھا گیا۔“ ایلی نے بے پرواں سے کہا۔

اس پر میم آگے بڑھی اور انگلیزی میں پوچھنے لگی۔

”زنانہ بورڈنگ ہاؤس کے سامنے بیٹھنے کا مطلب۔“

زنانہ بورڈنگ ہاؤ۔ ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا مجھے یہ معلوم نہ تھا ایلی اٹھ بیٹھا ”آئی ام ساری۔“

”لیکن تم ہو کون۔“ وہ بولی۔

زنانہ بورڈنگ کا نام سن کر ایلی کو خیال آیا کہ ضرورام کے نے کوئی شرارے کی ہو گی۔ اس خیال پر وہ محتاط ہو گیا۔ ”دیکھئے محترمہ“ وہ بولا ”میں راہ گیر ہوں بھائی دروازے جانا ہے تھک گیا۔ تو ذراستا نے بیٹھ گیا مجھے علم نہ تھا کہ یہ زنانہ بورڈنگ

ہے۔

”کیا کرتے ہو وہ بولی۔“

”پر دلیکی ہوں کام سے لا ہو رہیں آیا ہوں۔“

”ہوں۔“ وہ غور سے ایلی گی طرف دیکھنے لگی پھر اس کا روایہ

بدل گیا۔ بولی ”تم نے ادھر کوئی آدمی گزرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے کیا۔“

”نہیں تو!“ وہ بولا ”کیوں کیا بات ہے۔“

”یہاں چوری کی واڑا تھیں ہورہی تھیں آج کل،“ وہ بولی۔

”اچھا،“ ایلی نے کہا۔ ”تو مجھے چلے جانا چاہئے یہاں سے۔“

”مٹھرو۔“ لاشیں والا جوان چلایا۔

”نہیں نہیں جانے دو شریف آدمی ہے۔“ میم نے کہا۔ اور ایلی چاپ چاپ چلتا

رہا۔

ابھی چند ہی قدم چلا ہو گا کا ندھیرے سے ایک ساری اس کی طرف لپکا۔ وہ گھبرا کر رکا۔

”ڈر گئے کیا۔“ ام کے کی آواز آئی۔

”اے تم ہو۔“

”ہاں میں ہوں۔“

”کسی سہیلی سے ملنے آئے تھے کیا۔“

”اے یار،“ وہ بولا ”مصیبت یہ ہوئی کے دیوار پھلانگتے ہوئے کسی چوکیدار نے دیکھ لیا۔“

”تو کیا دیوار پھلانگ کر اندر گئے تھے۔“

”اور تو کیا صدر دروازے سے جاتا۔ پیٹا زنانہ بورڈنگ ہے اندر جانے دیتا ہے کوئی۔“

”کسی روز مار کر بھر کس نکال دیں گے تمہارا۔“ ایلی نے کہا۔

”یار کیا کروں؟“ ام کے ہٹنے لگا۔ ”اس ظالم سے ملے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔  
جان من ان لڑکیوں کے دل میں عزت اور محبت پیدا کرنی ہو تو دلیری و کھانی پڑتی  
ہے سیکھ لوگر یہ ہم سے۔“

ایلی کے روپروہنادی آکھڑی ہوئی۔ ”نه، وہ بولی ٹھیک نہیں ملے گا وہ پڑھ لیتا ہے  
تو خود آکر سر سے اتنا رگ لے جاؤ۔ پھر مانوں گی آپ کی ہمت۔“  
پھر ایک بزرگ تیک گھٹھی لڑک کراں کے پاؤں میں آگری اور سادی  
مسکرا کر کہنے لگی۔ ”خونگھٹ کے پٹھوں رہنے تو میں گے رام۔“

نه جانے ام کے کیا کہہ رہا تھا۔ غائب اہ زنا نے بورڈنگ میں واٹھ ہونے کا قصہ یا  
تفصیل سنارہا تھا۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ اس کی سیکھی کس قدر حسین ہے اور کتنی نگین۔  
لیکن ایلی کے روپروائیک اور حسین نگین تصویر کھڑی تھی۔ وہ اس سے باقیں کر رہی  
تھی۔ ”میں یہاں ہوں اس نگری میں۔ اگر ہمت ہے تو یہاں آ جاؤ۔ آ جاؤ نا۔ آ بھی  
جاو آ جاؤ گے تو سب کچھ مل جائے گا۔ سب کچھ لیکن تم کیوں آنے لگے۔ نہ جانے  
تمہیں کس کی لگن لگی ہے تمہارے لئے تو میں محض تفریغ تھی۔“

دوسرا طرف شہزاد کھڑی اس کی طرف حرست بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔  
”چلو تفریغ ہی سہی۔“ وہ آہ بھری کر کہہ رہی تھی۔ ”تمہارے لیے باعث تفریغ  
ہوں نا۔ یہ بھی میری خوش قسمتی ہے اور میں تمہیں دے ہی کیا سکتی ہوں۔ میرے  
پاس ہے ہی کیا جو دوں۔“

اگلے روز سارا دن ایلی اسی خیال میں کھویا رہا اسے بار بار زنا نے بورڈنگ کا خیال  
آتا اور پھر اس کی نگاہوں تسلی سادی کی سفید منزل آ جاتی اور وہ اس کے پیچھے بھاگتا  
اور دو بہنیں چھینت ”اگے!! اگے!!“ سارا دن وہ اسی خیال میں  
کھویا رہا شام کے وقت چپ چاپ کاٹ کے لان کے ایک انڈھیرے کو نے میں جا

بیٹھا اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ کسی سے ملے یا جی کے پاس بیٹھے۔

### زردوپڑھ

لان میں بیٹھے بیٹھے دعطا اسے احساس ہوا کہ قریب ہی کوئی شخصی آہیں بھر رہا ہے وہ چونکا سامنے پری کے پیچے کوئی بیٹھا تھا۔ شاید کوئی لڑکی ہو۔ وہ گھبرا گیا۔ لیکن اس نے اٹھ کر جانا مناسب نہ سمجھا۔ پھر کچھ دیر کے بعد پورے کے پیچے کسی نے ماچھس جلا کر سلگت سلا گیا۔ اور شام کو پہچان کروہ چلا یا۔

”تم ہو شام؟“ وہ بولا شام سے دیکھ کر گھبرا گیا۔

”شام آہیں کیوں بھر رہے تھے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”اب عمر بھر آہیں ہی برمان کا اور کیا؟“

”لیکن کیوں؟“

”یار کیا بتاؤں؟“ شام بولا۔ مسخروں نے میری منگنی ایک ایسی لڑکی کے ساتھ کر دی ہے جو زردوپڑھ اور حصتی ہے۔“

”تو کیا ہوا؟“

”اپنی تو زندگی ہی تباہ ہو گئی۔“

”کیوں؟ کیا وہ خوب صورت نہیں؟“

جو سر پر زردوپڑھ اور حصتی ہو وہ کیا خوب صورت ہو سکتی ہے۔ تمہیں نہیں معلوم شام دعطا سنجیدہ ہو گیا۔ میں ایسی لڑکی سے محبت نہیں کر سکتا جو زردوپڑھ اور حصتی بے حد سنجیدہ تھا۔ شام اور یوں سنجیدہ ہو یہ بات ایلی کے لئے حیران کن تھی۔

لیکن تمہاری منگنی کب ہوئی؟ ایلی نے پوچھا۔

”آج۔ ابھی ابھی وہاں سے آ رہا ہوں۔ چلو یار چلیں۔ کہیں چلیں کسی ایسی جگہ چلیں جہاں کھو جائیں سب بھول جائیں۔“

ایلی چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔ کچھ دیر تو وہ خاموشی سے چلتے رہے پھر شام

سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ باتیں کرنے لگا۔ دراصل وہ اپنی دلکی بھڑاس کا لانا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ سب کچھ کہہ دے سب کچھ اور اپنے دل کو ہلکا کر لے۔ اس کے انداز بیان میں دکھ تھا اس کے تبعیم میں بلا کی طرف تھی۔

”مجھے کسی سے محبت کرنی پڑے گی۔“ ہال۔ ابھی فوراً ورنہ زندگی کیسے کئے گی۔ لیکن مجھ سے محبت کرنے والا کوئی بھی تو نہیں مانتا جی بچپنے ہی میں چلی گئیں۔ کوئی بڑی بہان ہوتی تو شاید بات بن جاتی میرے کوئی بہان نہیں اور پشاور جی۔ لیکن کبھی پتا نہ بھی محبت کی ہے۔ اونہوں۔ آج تک مجھے سے کسی نہ محبت نہیں کی اور اب انہوں نے میرا ناط ایک اڑکی سے جوڑ دیا ہے جوڑ ردو پشتو اور حصتی ہے۔ مجھے سے زیادہ دلکی کون ہو گا۔“ وہ باتیں کے آیا اور ایک چیلہ ستارہ بنا۔

”اے۔“ انہوں نے تعب سے اس گلی کی طرف دیکھا جس کی طرف لوگ بھاگے جا رہے تھے ان کے گلے میں ہار تھے۔ ہونٹوں پر تبعیم اور انداز میں عجب جوش و خروش تھا۔

”یہاں کیا شادی ہے؟“ شام نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”مسلمانوں کی معلوم ہوتی ہے۔“

”شاید۔“

## ماں اور بیٹا

”چلو یار چلیں ہم بھی شادی میں شیک ہو جائیں۔“ دیکھیں تو بن بلائے مہمان بننے میں کیا مزا ہے۔“ گلی میں داخل ہوتے ہی شام نے حیرت سے چیخ سی ماری ”اے۔“ وہ بولا ”یہ تو چکلا ہے۔ سب بیسوائیں بیٹھی ہیں۔“ پہلی مرتبہ شام نے حرمت سے چیخ سی ماری ”اے۔“ وہ بولا ”یہ تو چکلا ہے۔ سب بیسوائیں بیٹھی ہیں۔“ پہلی مرتبہ شام کی ہنسی میں دکھ کا غصہ نہ تھا ”آؤ یار آؤ۔“ وہ بچوں کی طرح چلا یا۔

”ویکھیں تو یہ شارہ بھی تو شادی سے کم نہیں۔“

گلی میں جگہ جگہ کھلے دروازوں اور کھڑکیوں میں بیسوائیں بیٹھی تھیں۔ ہر بیسوائے سامنے لوگ کھڑے اس کی طرف گرنے لگا ہوں سے دیکھ رہے تھے۔ کچھو یے یہ گھور رہے تھے۔ کچھو یے یہ ای گھور رہے تھے۔ کچھو انہیں چھیر رہے تھے۔

پہلے ہی کھلے دروازے پر شام رک گیا۔ کچھو دیر تو وہ اسے جانچتا رہا پھر وہ بھول گیا کہ کہاں کھڑا ہے اور اس کی ٹکنیکس رنگ کا دو پہنچتی ہے اور وہ کالج کا طالب علم ہے۔ وہ ایسے خصوصی رنگ میں چکانے لگا۔

”کیوں جی۔“ وہ بیسوائے مخاطب ہو رہا تھا۔ ”کوئی ہے مال وال۔“

بیسوائے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دی۔ دروازے کے سامنے کھڑے لوگوں نے شام کی طرف دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں حیرت جھلکی کوٹ پتلون میں مسکرتا ہوا نوجوان لڑکا اس گلی میں شاید کبھی نہ دیکھا گیا تھا چونکہ وہ جگہ مزدوروں اور جاؤں کے لئے مخصوصی تھی اور سب بیسوائیں نچلے درجے کی تھی۔

”ہے کوئی مال وال۔“ شام نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

بیسوائے پھر مسکرا آئی اور اپنی چتوں سے اشارہ کیا۔ جیسے کہہ رہی ہو بہت ہے آجائو۔

”تو ذرا دکھاو نہ ہمیں،“ شام مسکرا یا۔

اس پر لوگ ہٹنے لگے۔

”کچھ ہو تو دکھائے۔“ ایک نے قہقہہ مارا۔

”سب لٹا ہوا ہے۔“ دوسرا بولا۔

”نہیں نہیں ضرور کچھ چھپا کر رکھا ہو گا۔“ شام بولا ”کیوں ہے نایی بات“

بیسوائے اپنی آنکھیں شام کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

”اندر صندوق میں ہو گا۔“ ایک بولا ”یہاں تو نہیں۔“

”اوہبُوں۔“ دوسرے نے کہا ”صد و تیجی تو لٹ گئی۔“

میسوں نے غصے بھری نگاہ سے لوگوں کی طرف دیکھا اور دروازہ ہند کر لیا لوگوں نے  
قہقہہ لگایا اور دوسرے دروازے کی طرف چل پڑے۔

شام کی باتوں پر ایلی خواہ مخواہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ ایسے بے تکلیف باتیں  
کرنا اور پھر ایسی جگہ جہاں پائے جانا بھی باعث شرم تھا۔ نہ جانے شام کو کیا ہو گیا  
ہے۔

”چلو چلیں اس نے شام سے کہا، یہ جگہ ٹھیک نہیں۔“

”جائیں گے کہاں؟“ وہ بولا۔ ”یک چوتھی رونق ہے۔ ایسی جگہ کہاں ملے گی؟“  
”واہ۔“

دوسرے دروازے پر جا کر وہ چلا یا۔ ”اوہبُوں دیوی یہ کیا قیص پہن رکھی ہے۔  
سینرگ کی چھپی چھپی۔ سرخ قیص پہن تو ہمیں جوش بھی آئے۔“

میسوں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”حالی باتیں ہی بناؤ گے یا آؤ گے بھی۔“

”کیوں نہیں آئیں گے؟“ وہ چلایا ”آئیں گے ضرور آئیں گے۔“

”تو پھر آ جاؤ۔“ وہ نہایت قیچ انداز سے ننگے اشارے کرنے لگی۔

”آئیں جوش میں بھی۔“ ایک بولا۔

”خود جوش میں آنے کافاً نہ ہمیں جوش دلانے تو بات ہے۔“ شام چلا یا۔  
لوگ ہٹنے لگے ”بھی بات تو ٹھیک ہے۔“ ایک نے کہا۔

میسوں نے نہایت بے حالی سے اپنی قیص اتاری اور لپک کر سرخ قیص کھوٹی سے  
اتار کر پہننے لگی۔ اس کی میلی انگیاد لیکھ کر سب چلانے لگے۔

”ذرا آہستہ آہستہ اتنی جلدی اچھی نہیں ہوتی۔“ شام نے کہا۔

سرخ قیص بہن کروہ شام سے مخاطب ہو کر بولی ”آب مرد کا بچہ ہے تو۔“

”میں تو مرد ہو۔“ وہ بولا ”بچہ نہیں ہوں۔“

اس پر لوگ بنتے۔

”تو پھر آنا۔“ وہ بولی۔

”آئیں گے آئیں۔ کل آئیں گے۔“ یہ کہہ کروہ آگے چل پڑا۔

اسی طرح وہ ہر جگہ رک کر باتیں کرتا رہا۔ ایسی کواس پر غصہ آرہا تھا۔ فضول ایسی باتیں کرنا نہ جانے شام کو گیا ہو گیا ہے اور پھر ایسی غلیظ جگہ اور وہ عورتیں لاحول والقوہ وہ کیا عورتیں تھیں۔

دفعہ شام کی نکاح آیک انہیں کو ٹھہری پر پڑی جہاں کوئی بنتی روشن نہ تھی۔ اور دروازے کے باہر ایک برا ضمانتی بیٹھی حقہ پی رہی تھی۔

”ارے،“ وہ چلایا۔ ”یہ دوئی ماں یہاں کس امید پر بیٹھی ہے۔ آؤ الیاس آؤ۔“

اس کے قریب جا کر شام کہنے لگا۔ مالی تم یہاں کس لئے بیٹھی ہو؟“  
ہو خاموش بیٹھی حقہ پیتی رہی۔

”کیا تم بھی بیٹھی ہو۔“ شام نے اپنا سوال پھر دہلیا۔

”وکھتا نہیں،“ وہ بولی۔

”کیا تمہارے پاس بھی کوئی آتا ہے مالی۔“ شام نے پوچھا۔

”بیٹھا اتنا ہی ترس آتا ہے تو تم خود کیوں نہیں آ جاتے۔“ وہ نہایت بے شرمی سے کہنے لگی۔

شرما کے ایلی ووب گیا۔ پھر وہ پڑا۔

”ارے ٹھہرو تو۔ میں نے کہا ٹھہرو نا۔“ شام چلا رہا تھا۔ لیکن ایلی بھاگے جا رہا تھا۔ پیچھے پیچھے شام آ رہا تھا۔ اور اگلی کے سب تماشیں ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ٹھہراو

ٹریننگ کالج کی زندگی کے پہلے دور میں ایک مسلسل کشکمش تھی افطراب تھا ہر کوئی پر جوش تھا۔ پر امید تھا۔ کوشش تھا۔ لیکن چھا ایک ماہ کے بعد لا کیوں کی زندگی

نے دوسرا خپٹ لیا۔ بیشتر لڑکے جوڑ کیوں پر اڑ ڈالنے کے لئے بے تاب تھے۔  
مایوس ہو گئے۔ اور ان کی توجہ کسی اور طرف منعطف ہو گئی۔

ادھر لڑکیوں نے اپنا اپنا حلقہ اور اپنا اپنا مرکز متعین کر لیا۔ اس طرح زندگی میں  
ایک ٹھہر اور پیدا ہو گیا۔ جیسے مدنے پانی کا بھرا گلاں پچھے دریے کے بعد تھر کر صاف ہو  
جاتا ہے گردو غبار سب بیٹھ جاتا ہے۔

لڑکیوں کی وہ پر شور محفیلیں ختم ہو چکی تھیں۔ اب ہر لڑکی امتحان کی تیاری کے  
لئے ایک مخصوص کون مقرر کر لیا تھا مثلاً اس رسموں اسی اس بیچ پر بیٹھا کرتی جو لان کے  
شمائل کو نے میں جھائیوں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ میں راوی اپنے سامنے روم کے عقب  
میں بنی ہوئی گیارہی اپنے ایک مخصوص کرکٹ تھی۔ جہاں سے ادھر ادھر جانے کا کوئی  
راستہ نہ تھا۔ کالج کے لان میں پڑے ہوئے بیچ سب قائم ہو چکے تھے اور مخصوص  
مقامات پر رکھ دیئے گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ امتحان کی تیاری اکیلے میں تو نہیں ہو سکتی ایک ساتھی کا ہونا ضروری  
ہوتا ہے اور ایک سے زیادہ ساتھی ہوں تو بھیڑ لگ جاتی ہے اور پوری توجہ سے کام  
نہیں ہوتا۔ غالباً اسی وجہ سے لڑکیاں تقریباً تقریباً عنقا ہو چکی تھیں۔ عام طور پر وہ  
دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ البتہ کوئی خاص پیکھر ہوتا تو وہ اپنے اپنے ڈرلوں سے نکل  
آتیں اور لیکھر ختم ہونے کے بعد پھر وہیں لوٹ جاتیں۔

رانے نے پھر سے گاؤں جانا شروع کر دیا تھا۔ اور ہر بار گاؤں سے واپس آنے  
کے بعد ایلی کو اس لڑکی کے قصے سناتا جو اتنی بولڈ تھی کہ حد نہیں اور جس کی بولدنس کی  
وجہ سے اس کے پیروں نے احتجاجاً کھانسنا اور تپوری چڑھانا چھوڑ دیا تھا۔

بابا کی تمام تر توجہ بورڈنگ کے پچھوڑے کے ایک مکان پر مرکوز ہو چکی تھی اور  
وہ روز ایلی کو بتایا کرتا تھا کہ لا جوئی بیچاری سارا سارا دون وھوپ میں کھڑی رہتی  
ہے۔ پاگل لڑکی اس طرح وہ اپنی صحت خراب کرے گی۔ لیکن بابا کے سمجھانے کے

باوجو دلا جو نتی اپنے مکان کی کھڑی کی میں کھڑی ہو کر بابا کو دیکھنے پر مجبور تھی۔

## لا جو نتی

لا جو نتی کا قسہ بھی عجیب تھا۔ سب سے پہلے لا جو نتی کو شام نے دیکھا تھا۔

شام دوڑا دوڑا ایلی کے پاس آیا ”لو بھی“ وہ چلانے لگا ”اپنا تو جیون کھل ہو گیا۔“

”وہ کیسے“ ایلی نے پوچھا۔

”اپنا بھی ایک گاہک پیدا ہو گیا۔“

”کیوں کیا کاف والیوں میں سے کوئی مہربان ہو گئی۔“

”اوہ ہو۔ وہ سب سخت ملتی سے بنی ہیں۔ یاداں پر اثر ہی نہیں ہوتا۔ انہیں وہ وہ باتیں سنائی ہیں کے ذرا شرم ہوئی تو میرے پریم میں ڈوب جاتیں۔ اور صرف باتیں ہی نہیں تماشے دکھائے ہیں کرتے دکھائے ہیں مسخر این کر رائنوں کو مخلوق کیا ہے اور پھر کلاس میں وہ وہ بر لیکٹ باتیں کی ہیں۔ اپنی لیاقت کی وحشیک بحدادی ہے۔ اتنا اثر ڈالا ہے کہ کوئی حد نہیں۔“

”تو کیا ان سب باتوں کا اثر نہیں ہوا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”اثر تو ہوتا ہے۔ ہنساتا ہوں تو نہستی ہیں۔ اتنا نہستی ہیں اتنا نہستی ہیں کہ پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ چمکدار بات کرتا ہوں تو بڑی بڑی آنکھیں کھول کر دیکھتی ہیں جب لیاقت کی وحشیک جماتا ہوں تو مر مر کر دیکھتی ہیں۔“

”تو پھر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”بس چند ایک منٹ تو بھیگی رہتی ہیں پھر پر خشک ہو جاتے ہیں تو سالی پھر سے اڑ جاتی ہیں اور پھر جیسے جانتی ہی نہ ہوں۔“

”تو پھر یہ نیا گاہک کون ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”پتہ نہیں یار کون ہے۔ کوئی سکول کی دکھتی ہے۔ ہماری دار میٹری کے

چچھوڑے میں ان کا مکان ہے۔ ایک روز میں نے ویسے چھیٹر خانی کے لئے دو ایک اشارے کر دیئے تھے اب سالی کھڑکی میں یوں جمی رہتی ہے جیسے سریش لگا کر جوڑ دیا ہو کسی نتے اپنے لئے جتنی سیت ہو رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ایلی بولا۔ ”تمہیں بھی لٹک کے لئے ایک کھوٹی ہی چاہیے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ شام ہنسا۔ ”لیکن وہ تو خود لٹک رہی ہے۔“

”یہ تو بلکہ اور بھی اچھا ہے،“ ایلی نے کہا۔ ”پکا پکا یا مل گیا۔“

”اوہ ہوں۔“ وہ بولا۔ یار لوگوں کو تو مار کر کھانے کی لٹ پڑی ہے۔ ”عجیب بات ہے ناؤہ بولا۔“ اگر لٹک جائے تو اپنی طبیعت نہیں جنتی اور اگر وہ پروانہ کرے تو ہم خود لٹک جاتے ہیں۔“ ایلی ہنسنے لگا۔

”ایک بات اور ہے،“ شام بولا۔

”وہ کیا؟“

”لا جونتی کی عمر بہت چھوٹی ہے۔“

”اس میں کیا ہے۔ جتنی چھوٹی عمر ہوگی۔ اتنا جذبہ بے لوث ہوگا۔“

”اوہ ہوں۔“ میں تو میار چاہیے جو میں لو ریاں دے دے کر سلانے پٹ پٹ کر جگائے اپنے بازوؤں میں سنjalے۔“

اسی شام وہ دونوں بورڈنگ سے نکل کر اس مکان کی طرف سیر کے لئے نکل گئے جہاں لا جونتی کا گھر تھا تاکہ قریب سے لا جونتی کو دیکھ سکیں۔

لا جونتی چودہ سال کی تڑکی تھی۔ اس کا رنگ سانوا تھا لیکن نقوش جاذب نظر تھے نگاہوں میں عجیب دیوانگی سی تھی اور انہا از سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے محبت کی دنیا کے طور طریقے سے ابھی ناواقف ہو جیسے کوئی دلیز پر کھڑا ہو اور زندگی کے ایوان میں داخل ہونے کے لئے بتاب ہو۔

والپسی پر ایلی کو سوچھی۔ ”یا را یک بات کہوں بڑا مزار ہے گا جو تم مان جاؤ تو۔“

اس روز انہوں نے مل کر سازش کی کہ کسی طرح بابا کو یہ غلط فہمی دے دی جائے کہ لا جونتی اسے دیکھنے کے لئے کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے۔ چونکہ بابا جس دارمیٹری میں رہتا تھا وہاں سے بھی لا جونتی کام کان صاف دکھائی دیتا تھا۔

اس مذاق کی وجہ یہ تھی کہ ایلی بابا کی باتیں سن کر شک آچکا تھا۔ بابا یوں بات کیا کرتا تھا جیسے ہر جوان لڑکی اس پر رین جھی ہوتی ہو۔ اسے یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ وہ بیوڑا ہو چکا ہے۔ منہ پر جھریاں پڑی ہوئی ہیں اور جوان لڑکیاں بھلا بابا سے کیسے محبت کر سکتی ہیں۔ چند ہی روز میں ایلی نے بابا کو یقین دلا دیا تھا۔ کہ لا جونتی اس پر دل و جان سے ندا ہو چکی ہے اور اس کے لئے ہر وقت کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے۔

اس کے بعد بابا روز ایلی کو لا جونتی کے قصے سنایا کرتا تھا۔ اور ایلی سمجھتا کہ بابا نے ایک افس لیلے کی دنیا بسرا کھی ہے۔ جسے حقائق سے کوئی تعلق نہیں اس لئے وہ بابا کے قصے یوں سنایا کرتا تھا جیسے طوطا مینا کی کھانیاں ہوں اس نے انہیں کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ دل ہی دل میں وہ بابا کی حماقت پر ہنسا کرتا تھا پھر ایک روز رات کے نوبجے کے قریب بابا ایلی کے پاس آیا۔ اس وقت خوب بن ٹھن کر آیا تھا۔

”اے،“ ایلی نے کہا ”آج تو وہا بننے ہوئے ہو۔“

”ہاں یا ر۔ آج وہاں جانا ہے ن۔ اس لئے میں نے کھا ذرا اچھے کپڑے پہن لول۔“

”کھا جانا ہے؟“

”بھئی وہیں“ بابا بولا۔ اس نے اشارہ کر کے کہا۔

”وہاں کھاں؟“

”لا جونتی نے بلا یا ہے۔“ بابا نے اس کے کان میں کہا۔

”اے \_\_\_\_\_!“ ایلی کو بھولی ہوئی لا جو نتی یا داؤ گئی۔ اس نے بلوایا ہے۔“  
”ہاں،“ وہ بولا۔ بیچاری کتنے دنوں سے بلا رہی ہے۔ کہتی ہے گھروالے کہیں  
گئے ہوئے ہیں۔ گھر میں وہ اکیلی ہے۔“

”اے，“ ایلی سمجھ رہا تھا کہ بابا یا ہے یہی گپ چلا رہا ہے۔ یا شام کد لا جو نتی اسے  
بلا رہی ہو۔

”ذر امیرے ساتھ چلو گے۔“ بابا نے کہا ”وہاں تک۔“  
”کیوں؟“  
”ایے معاف میں نہ آتھی ہو تو اچھا رہتا ہے۔ صرف مکان تک چلانا پھر چے  
آن۔“ بابا نے کہا۔  
”کب؟“ ایلی نے حیرت سے پوچھا۔  
”ابھی اور کب۔“

”ابھی \_\_\_\_\_!“ ایلی نے حیرانی سے بابا کی طرف یوں دیکھا  
جیسے وہ پا گل ہو گیا ہو وہ دونوں چل پڑے ایلی سمجھ رہا تھا کہ شام کد بابا کا  
دماغ چل گیا ہے۔ وہ چپ چاپ چلتے گئے۔ ایلی دل ہی دل میں بابا کی سادہ لوچی پر  
ہنس رہا تھا۔

لا جو نتی کے مکان کے نیچے وہ دونوں رک گئے۔ بابا نے کھڑے ہو کر سگرت  
سلگانا شروع کیا بابا نے ایک ایک دو ماچس جلائی تو آہستہ سے مکان کا دروازہ گھلا۔  
باتھ میں لاثین اٹھائے لا جو نتی دروازے میں کھڑی تھی۔ ”اچھا بھئی۔“ کہہ کر بابا  
امدر داخل داخل ہو گیا اور ایلی حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا  
رہ گیا۔

### ونڈ ولینڈز

وہاں سے واپس آتے ہی ایلی شام کی طرف گیا۔ وہ شام کو لا جو نتی اور بابا کی

ملاقات کا قصہ سنانے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ ڈارمیٹری میں شام اسے دکھائی نہ دیا تو اس نے گوبند اور پریم سے پوچھا کہ شام کہاں ہے۔

”میں تو تھا ابھی۔“ وہ بولے۔ ”شاید کسی اور ڈارمیٹری میں بیٹھا گیں ہاں کر رہا ہو۔“ ایلی دیر تک ڈارمیٹری میں گومتا رہا۔ جب وہ باہر آنے لگا تو راستے میں لالہ جی مل گئے۔

”کسے تلاش کر رہے ہو؟“ وہ بولے۔  
”شام کو ڈھونڈ رہا ہوں۔“ ایلی نے کہا۔ وہ کہیں چھٹی پر لوٹنے میں آیا۔  
”خیں وہ تو حاضر ہے۔“ وہ بولے ”اس کہاں رہا تھا کہاں کی طبیعت خراب ہے اور وہ سو گیا ہے۔“ ایلی بولا ”طبیعت خراب ہے۔“

”لالہ جی کے جانے کے بعد وہ پھر سے شام کی ڈارمیٹری میں داخل ہوا۔“

”شام کہاں ہے۔“ اس نے داس سے پوچھا۔

”اس کی طبیعت اچھی نہیں،“ اس نے جواب دیا ”سو گیا ہے۔“  
ایلی شام کی سیٹ کی طرف جانے لگا تو اس نے اس کی بانہہ پکڑ لی۔ ”خیں یاڑ، وہ منت سے بولا۔“ اسے نہ چلکا۔ مشکل سے آنکھ لگی ہے۔“

ایلی باہر نکل آیا لیکن باہر آتے ہی اس نے محسوس کیا جیسے کوئی بات ہو۔ کہیں شام نے کچھ کھا تو نہیں لیا۔ شام کد زرد ووپٹے والی منگیتر کی وجہ سے وہ رک گیا۔ اور پھر سے دبے پاؤں شام کی ڈارمیٹری کی طرف چل پڑا۔ اب کی باروہ اس کی سمت سے داش نہ ہوا جدھر اس کی سیٹ تھی بلکہ پرلی طرف داخل ہو کر دبے پاؤں شام کی سیٹ کی طرف چلا آیا۔ چار پاپی کے قریب پہنچ کروہ رک گیا۔ واقعی یہ تو سور ہا ہے۔ اس نے سوچا۔ خواہ مخواہ تنگ کرنے کا فائدہ نہیں میں نہیں جلتا اے۔ وہ چار پاپی کے قریب تر ہو گیا۔ پھر اس نے جانے کس خیال رسرا نے کی طرف سے

چادر کا پلو اٹھایا۔ ارے وہ پھوپھو کارہ گیا۔ بستر میں شام نہیں تھا۔ چار پانی پر چاہ دلتے اوور کوٹ اور جانے کیا کیا یوں رکھا ہوا تھا جیسے کوئی سویا ہوا ہو۔

جب ایلی اپنے کمرے میں پہنچا اس وقت آفریباً بارہ کا وقت تھا۔ ان دونوں جی کے اور ایلی اپنے کمرے کو چھوڑ کر بورڈنگ کے ہسپتال کے ان ڈور وارڈ میں رہتے تھے۔

ایک روز فٹ بال کھیلتے ہوئے جی کے گر پڑا تھا اور اس کی شن بون ٹوٹ گئی تھی۔ اور ڈاکٹر نے اس کی نائگ کو پہتر کر دیا تھا۔ چونکہ بورڈنگ اور کالج کے تمام لڑکوں سے جی کے مراسم تھے ابتداء ان کے کمرے میں اکثر بھیر لگی رہتی تھی لڑکے اس کی عیادت کو آتے تھے ہر وقت کوئی نہ کوئی جی کے پاس بیٹھا رہتا تھا اس بات کو محسوس کر کے لا لہ جی نے خود انہیں کہا تھا کہ وہ ان ڈور وارڈ میں چلے جائیں تو ان کے لئے آسانی رہے گی۔

ان ڈور وارڈ بورڈنگ کے ساتھ ملحت تھا لیکن وہ بورڈنگ سے الگ سمجھا جاتا تھا۔ اور وارڈ میں رہنے والے ان تمام پابندیوں سے مبراتھے جو بورڈنگ میں رہنے والوں پر حاکم تھیں۔ مثلاً بورڈنگ میں وہیں بجے باقاعدہ حاضری لگاتی تھی اور پھر باہر کے دروازے مقفل کر دیئے جاتے تھے اور لا لہ جی کی اجازت کے بغیر کوئی شخص نہ تو باہر جا سکتا تھا اور نہ اندر داخل ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بورڈنگ میں مہمانوں کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ ان ڈور وارڈ میں یہ پابندیاں نہ تھیں۔ وارد کا ایک دروازہ باہر کھلتا تھا۔ اس لئے وہ باہر جانے یا اندر آنے کے لئے قطعی طور پر آزاد تھے۔ اور باہر کے مہمان بے روک لوگ ان کے پاس آ سکتے تھے۔

یہ وارڈ ایک فرخ ہال کمرا تھا جس میں متعدد کھڑکیاں اور دروازے تھے اسکی ساخت ڈار میٹریوں سے مختلف تھی۔ دراصل یہ ایک نیا ونگ تھا جو حال ہی میں بنایا گیا۔ اور چونکہ ابھی باقی انتظامات مکمل نہ ہوئے تھے اس لئے نہ تو وہاں کوئی نرس تھی

نہ ڈاکٹر صرف چار ایک خالی بیٹھ پڑے ہوئے تھے۔ لہذا جی کے اور ایلی نے اپنا تمام سامان کتابیں صندوق چار پائیں میز کر سیاں وہاں منتقل کر دی تھیں۔

چونکہ جی کے ڈیڑھ ماہ سے صاحب فراش تھا اس لئے کافی اور بورڈنگ کے لئے اکثر تفریح کے لئے وہاں آجیا کرتے۔ سارا سارا دن وہاں تاش کھیلا جاتا کیرم چلتا۔ شترنخ کی بازیاں کھیلی جاتی۔ اس طرح وہ کمرہ کوئن روم کی حیثیت اختیار کر گیا تھا ایک ایسا کوئن روم جہاں ہر وقت دھماچوکڑی رہتی۔ اور جہاں شور مشانا اور زندگانی کا بدل اعتراض نہیں سمجھا جاتا تھا۔

وارد میں منتقل ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ ایلی کو ہر وقت بورڈنگ میں داخل ہونے یا وہاں سے باہر جانے کی اجازت مل چکی تھی۔ دروازے پر بیٹھا ہوا چوکیدار سے دیکھ کر آپ اسی آپ انتہا اور پھر بن پوچھے ہمیں دروازہ کھول دیتا۔ شام کی ڈارمیٹری سے نکل کر جب وہ باہر آیا تو چوکیدار نے حسب معمول دروازہ کھول دیا اس وقت گیارہ بجے تھے جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو بتی جمل رہی تھی اور جی کے اکڑوں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے لکھنے کا پیٹھ اپڑا تھا اور قلم ہاتھ میں تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے بستر کی طرف بڑھا۔ بستر جھاڑتے ہوئے اس نے جی کے سے پوچھا۔

”کیا لکھ رہے ہو؟“

جی کے نے کوئی جواب نہ دیا۔

”میں کیا پوچھا رہا ہوں۔“ ایلی نے کہا۔

کوئی جواب نہ پا کروہ مڑا۔ جی کے کے قریب گیا۔ جی کے اسی طرح بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ بڑی محنت کر رہا ہے بیچارہ۔ ایلی نے سوچا۔

دفعاً اس کی نگاہ پیٹھ پر پڑی عنوان کو دیکھ کر وہ پھونچ کارہ گیا۔ لکھا تھا میری پیاری سفینہ۔ سفینہ۔ ارے سفینہ کون تھی اور پھر پیاری جی کے اور پیاری۔ یہ کیسے ہو سکتا

ہے ایلی جی کے کے سب تر بھی رشتہ داروں کو جانتا تھا اسے جی کے کی ہمشیرہ والدہ کے نام معلوم تھے۔ لیکن یہ سفینہ۔ کون تھی۔ کیا جی کے بھی کسی کی محبت میں گرفتار تھا۔ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے اسے اڑکیوں سے محبت کرنے کے شغل سے سخت نفرت تھی وہ محبت کا نداق اڑایا کرتا تھا اور اسے ہوش ہے تعبیر کرتا تھا۔ صراط مستقیم پر چلنے والا شخص کسی کو میری پیاری سفینہ لکھے ایک حساب دان۔ ایک اصولی آدمی۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا شاید یہ خط کسی عزیز کو لکھا ہو۔ ایلی نے پیدا اٹھا لیا اور باہر نکل گیا تاکہ چھپ کر خط پڑھ کے۔

واقعی وہ ایک محبت بھرا خط تھا۔ جی کے اور یہ جذبات! ایلی حیرت سے اس سوئی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا سمجھے کیا جی کے کی وہ شخصیت جس سے ایلی واقع تھا محض ایک بھروسہ تھی۔

ایلی کچھ سمجھے میں نہیں آ رہا تھا۔ ابھی اسے انسانی کردار کے تضاد کا شعور نہ تھا۔ اس نے پیدا کو رکھ دیا اور سوچ بچار میں کھو گیا۔ دلتا اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ پھر وہ چپکے سے باہر نکل گیا۔

باہر بر گد کے درخت کے نیچے سادی کھڑی نہ رہی تھی۔ ”آؤ مہاراج جی آیاں نوں،“ وہ مسکرانے لگی ایلی؛ یہ نے ماچس کا ڈبیہ ہاتھ میں تھام رکھی تھی۔ سگرٹ ہونٹوں میں دبارکھا تھا جسے سلاگانا وہ بھول گیا تھا۔

سادی نے اس ان سلے سگرٹ کی طرف دیکھا۔ ”سگرٹ خود لگا گئیں گے مہا راج یا میں لگاؤں۔“ وہ مسکرائی ایلی چونکا اس کو وہ رات یا دماغی جب وہ سفید منزل کی سیڑھیوں میں ضد کئے بیٹھا تھا کہ سادی خود سگریٹ سلاگا کر دے۔

”تو بہے۔“ سادی بولی ”کوئی ایسا ضدی بھی نہ ہو۔“

ایلی نے سگریٹ سلاگایا اور پھر کالج کی طرف چل پڑا۔ کالج کی عمارت چاندنی میں چمک رہی تھی۔ عمارت کی چھت پر چپڑا و کھڑی

تھی۔ ارے وہ گھبرا کر رکا واقعی کالج کی چھپت پر کوئی تھا۔ نہ جانے کون ہے۔ کوئی ہو گا اس نے سوچا۔ شاید چوکیدار ہو۔ وہ گھبرا گیا کالج کا چوکیدار بہت سخت آدمی تھا۔ وہ پرنسپل کو رپورٹ کرنے سے نہ چوتھا تھا۔ اسی وجہ سے لڑکے رات کے وقت ادھر آنے سے ڈرتے تھے۔

ایلی نے اپنا رخ بدلتا دیا۔ وہ مغربی سمت کو چل پڑا جس طرف کالج کا لام تھا۔ اس وقت سارا لام چاندنی میں جنم گارہتا تھا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ کسی نئے پر بیٹھ کر اس پھیلی ہوئی چاندنی کو دیکھ جو اسے سادی اور شہزادی یاد دلارہی تھی لیکن لام میں جانا خطرناک تھا۔ اوپر سے چوکیدار نے دیکھ لیا تو لام میں کوئی بچن بھی تو نہ تھا۔ تمام نئے لوگوں نے لام کا اتحاد اس سے ماحصلہ باقی تھا۔ رکھ دیتے تھے جہاں بڑی بڑی جھاڑیاں تھیں۔ ایلی ان جھاڑیوں کی طرف چل پڑا۔

دفعتا وہ رکا۔ ان جھاڑیوں سے آوازیں آرہی تھیں۔ وہ مقاطعہ ہو گیا اور ایک پودے کے نیچے چھپ گیا۔

”بھگوان کی سونگند میں زہر کھالوں گا۔“ کوئی چلا رہا تھا۔ ”میرے پاس ہے۔ میرے ٹرنک میں پڑی ہے جج کہہ رہا ہوں۔ صبح آؤ گی تو دکھاؤں گا۔“

”زہر ٹرنک ارے،“ ایلی نے شام کی آواز پہچان لی۔  
شام یہاں اور یہ ساتھ کون ہے۔ ایلی چپکے سے بیٹھ گیا تاکہ کسی کو نظر نہ آئے کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر آواز آئی ”بس اس قصے کا یہی انجام ہو گا“ اور

آوازیوں دفعتا بند ہو گئی جیسے کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

”ایسی باتیں مت سمجھئے،“ کوئی بولی۔

”تو کیسی باتیں کروں۔“

”پیار کی باتیں۔“

”اس پیار نے اپنا دیوالیہ نکال دیا ہے۔“

”کیوں۔“ وہ بولی۔

شام ہنسا ”بس صح شام مر رہے ہیں۔ پڑھنے کی فرصت کے ہے۔ اور بھگوان

جانے امتحان میں بخخ کاغذاتے گا مرغ کا نہیں۔“

ایلی ہٹنے لگا واقعی شام ہے اس نے سوچا۔

وہ فتنی۔

”لیکن کچھ پرواہ نہیں۔“ شام نے کہا۔ ”چاہے شتر مرغ کا ملے پر اگر تم نے

ایسی بے پرواہی کی تو پھر

”اوہ ہوں۔“ وہ بولی ”پھر وہی بات۔“

”بھگوان جانے میں جھوٹ

اس کی بات ادھوری رہ گئی با غصے میں خاموشی چھا گئی پر اسرار خاموشی ایلی نے  
محسوں کیا کہ اس سے چلے جانا چاہئے وہ اٹھ بیٹھا اور دبے پاؤں باہر آیا پھر وہ  
اپنے کمرے کی طرف چل پڑا کمرے میں پہنچ کر اس نے بکلی بجھادی اس کے دل  
میں ایک عجیب طوفان مچا ہوا تھا۔ اس نے ] پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ سب اپنی  
دھن میں کھوئے ہوئے تھے۔ ہر کوئی اپنی ڈفلی بخار ہا تھا۔ اپنی مرلی کی دھن پر ناق رہا  
تھا۔ وہ ایک دوسرے سے اس قدر قریب تھے۔ لیکن اتنی دور بہت دور  
ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی ایک کو دوسرے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ رات ایلی کے  
لئے گویا الف لیلے کی ایک رات تھی غالباً اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ اس ونڈر  
لینڈ میں ایسیں کی حیثیت رکھتا ہے اور ایسیں بذات خود ایک ونڈر لینڈ تھی۔

### پہلا سبق

امتحان کے قریب آنے پر لڑکوں کے پریکٹیکل لیسز شروع ہو گئے اور اسپاٹ کی  
تیاری میں مصروف ہو گئے پھر انہیں پریکٹیکل کے لئے مختلف سکولوں کی جماعتیں مل

گیکیں جہاں انہیں بچوں کو ایک مہینے کے لئے عملی طور پر پڑھانا تھا۔

لبی تی اور الیں ڈی کے طلبہ کی ڈیوٹیاں مختلف سکولوں میں لگ گئیں۔ کسی کو دلی دروازے کے درسے میں متین کرو دیا گیا کسی کو بھائی دروازے اور کوئی شیر انوالے بھیج دیا گیا۔ ان تعیناتوں کی وجہ سے کالج کی زندگی کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ کالج لان کی جھاڑیوں میں رکھی ہوئی تمام شخصیں ویران ہو گئیں۔ جماعتیں کے کمرے خالی دکھائی دینے لگے۔ بورڈنگ میں آئے جانے اور ملنے ملانے کے اوقات اور بورڈنگ کے معمولات بالکل بدل گردہ گئے۔

خوش قسمتی سے ایلی کی ڈیوٹی سنترل ماؤنٹ سکول میں لگ گئی جوان کے ہوٹل کے متصل واقع تھا۔ اس بات پر ابھے یہ حد خوشی تھی۔ اس کے علاوہ سنترل ماؤنٹ سکول لاہور کے تمام سکولوں میں ایک معیاری مکمل مانا جاتا تھا۔ وہاں کے اسامدہ جدید طریقہ تعلیم سے واقف تھے اور پچھے بہت ذہین سمجھے جاتے تھے۔

پہلی مرتبہ جب ایلی سنترل ماؤنٹ سکول کی جماعت میں داخل ہوا تو کلاس ٹیچر نے اس کی طرف گھوکر دیکھا اڑ کے ایک دوسرے کو کہنی مار کر ہنسنے لگے۔

کلاس ٹیچر ایک بھاری اور بحدے جسم کا شخص تھا۔ اس کے ماتھے پر دامنی لشکن تھا جیسے پیشانی میں کھو دیا گیا ہو۔ انہیں سو جی ہوئی تھیں۔ چہرے پر بے حسی کا دینز پر دہ پڑا تھا۔ اور ہونٹ موٹی تھے۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی جسے وہ بار بار میز پر بجا تا تھا۔

”میں سنترل ٹریننگ کالج سے آیا ہوں۔“ ایلی نے کہا ”میر انعام الیاس ہے۔“ ”ہوں،“ کلاس ٹیچر نے اسے گھوڑتے ہوئے کہا اور ویسے ہی بیٹھا رہا۔ پیچھے اڑکوں کی ہنسی کی آوازیں آرہی تھیں۔

ایلی نے ایک بار پھر ملت جیانہ نگاہ سے کلاس ٹیچر کی طرف دیکھا لیکن وہ جوں کا توں بیٹھا اسے گھوڑتا رہا۔

”تو مجھے کب سے کام شروع کرنا ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔  
”یوں۔“ کلاس ٹیچر کی تیوری اور گہری ہو گئی۔

لڑکے قیفیہ مار کر نہ پڑے۔

اس پر کلاس ٹیچر کی توجہ لڑکوں کی طرف منتقل ہو گئی۔ اس نے چھٹری اٹھا کر زور سے میز پر ماری۔ اور پھر انٹھ بیٹھا۔

”یہ کیا بد تینیری ہے۔“ وہ فرمایا۔

”کیا اسے اپنی تمیز داری کے متعلق سچھ علم ہے۔“ ایلی نے سوچا۔

”اُدھر آؤ وحید۔“ وہ فرمایا۔ نیچے اترو۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ بھی اس جماعت کا لڑکا ہو اور کلاس ماستر نے وحید کی طرح اسے بھی نیچے بلا رکھا ہوا ارب وحید کے بعد اس کی باری ہو۔ گھبرا کروہ کمرے سے باہر نکل آیا اور برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔  
پچھدری کے بعد کلاس ٹیچر باہر نکلا۔

”ہوں،“ وہ ایلی کوڑا نشانہ ہوئے بولا۔ تو تمہیں ملی ہے یہ جماعت۔“

”جی۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”اور ایک ماہ میں تم اس کاستیا ناں کر دو گے؟“

ایلی محسوس کر رہا تھا کہ اب وہ کہے گا۔ ”نکالو ہاتھ۔“

”دیکھو۔“ کلاس ٹیچر نے اسے پھر ڈانٹا۔ ”کیا تمہیں علم ہے کہ ایک ماہ کے بعد مجھے تمہاری رپورٹ دینا ہو گی۔“

”جی۔“ ایلی بولا۔

”اور اگر میں نے گندی رپورٹ دی تو تم فیل کر دیئے جاؤ گے۔“

”جی۔“

”اگر مجھے اچھی رپورٹ لینی ہے۔“ وہ بولا۔ ”تو وعدہ کرو۔“

اس کے انداز میں اس قدر واضح ڈھونس تھی کہ ایلی جھٹ بولا اٹھا ”جی کرتا ہوں۔“

”وعدہ کرو کہ جو جدید طریقے تعلیم کے تم نے سکھے ہیں وہ میری جماعت پر نہیں برتو گے۔ انہیں آج سے بھول جاؤ گے۔ وہ محض با تھی کے دانت ہیں۔“  
ایلی کامنہ کھلا کا کھلاڑہ گیا۔

”یہ ڈنڈا ہے۔“ کلاس ٹیچر چھڑی ہلاتے ہوئے بولا۔ کلاس کا استعمال فرائدی سے کرنا ہو گا۔“  
”جی ہاں۔ جی ہاں۔“ ایلی چلا یا۔  
”سبق رٹو اکریا کیا کیا ہو گا چاہے، مجھیں یا نہ مجھیں۔“  
”جی۔“

”ہمیں نتیجہ دکھانा ہے پڑھانا نہیں۔“

”جی اچھا۔“

”تو تم وعدہ کرتے ہو۔“

”جی کرتا ہوں۔“

”تو جاؤ پڑھاو۔“ اس نے ڈرامائی انداز سے جماعت کی طرف اشارہ کیا۔

”بہت اچھا،“ کہہ کر ایلی چل پڑا۔

”مٹھرہ وہ بولا۔“ ”تم ڈنڈا تو بھول گئے۔“

”اوہ۔“

کلاس ٹیچر نے چھڑی ایلی کے ہاتھ میں تھما تے ہوئے کئی بار پھر اسے ڈانٹا۔

”خبردار جو اسے بھولے۔ ورنہ تمہاری رپورٹ  
ایلی کا نپتے ہوئے جماعت میں داخل ہو گیا۔  
لڑکے کھڑے ہو گئے۔“

”سٹڈاؤن“ ایلی نے کہا اور پیشانی سے پسینہ پوچھنے لگا۔  
لڑکے جوں کے تو کھڑے رہے۔

”سٹڈاؤن۔“ اس نے دہرایا۔

وہ ہنسنے لگے۔

”بیٹھ کر ہنسو۔“ وہ بولا۔

انہوں نے ایلی کو منہ چلانا شروع کر دیا۔ جماعت سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں پیدا ہوئے تھیں اس کو نے میں لگری چل رہی تھی بیک نک نک۔ ادھر پچھلی آنا پیس رہی تھی گھر گھر گھر۔ گھر۔ پرانی طرف موڑ شارٹ ہو رہی تھی۔ دروازوں پر رہا تھا۔ کہیں مرغاً اذالن میرے رہا تھا۔ بیان لڑکوں کی تھیں۔  
ایلی حیرت سے لڑکوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دیر تک وہ ان کی طرف دیکھتا رہا۔

پھر کلاس ٹیچر نے دروازے سے جھانکا۔

دفعاً کمرے پر بھیا نک خاموشی طاری ہو گئی۔

”تم ڈنڈے کو پھر بھول گئے۔“ ماشر نے ایلی کو ڈانٹا۔ اور تم نے وعدہ کیا تھا۔ کیا تھا یا نہیں؟“

ایلی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تم اچھی رپورٹ کے قابل نہیں ہو۔“ وہ بولا

پھر کلاس ٹیچر جس سرعت سے آیا تھا اسی سرعت سے چلا گیا۔

جماعت پھر سے آوازیں گونجنے لگیں۔

”فول فول۔“ کوئی چلا رہا تھا اگرچہ سب کے ہونٹ بند تھے۔

”سلی۔ سلی۔ ٹون\_\_\_\_ میاں وہ پ۔ دھڑاڑاڑوم۔“

ایلی سرخام کر کر سی میں بیٹھ گیا۔

جوں جوں امتحان قریب آتا جا رہا تھا کانج پر ادا سی کا ایک دیزیر پر وہ پڑا جا رہا تھا۔ لڑکوں کی وہ خوش گپیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ لڑکیوں کے چہروں سے مسکراہیں مفقود ہوتی جا رہی تھیں۔ پر وہ فیسروں کا روایتی حیرت انگلیز طور پر بدلتا تھا۔ اب وہ کانج کر لڑکوں سے یوں سلوک کرنے لگے جیسے وہ طالب علم نہیں بلکہ ہم کا رہوں۔ کونوں میں پڑے ہوئے بچوں سے رنگین ترقیہ سنائی جائیں بند ہو گئے تھے۔ وہاں یا تو خاموشی چھائی رہتی اور یا کبھی بھار بچکیوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ وہاں سے لڑکیاں باہر نکلتی تو ایسے معلوم ہوتا جیسے روشنی ہوں۔ شام کی رنگین باتیں باگلی ختم ہو چکی تھیں۔ ان کی گھنی بھنویں اور بھی بو جھل ہو گئی تھیں۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“ ایلی شام سے پوچھتا۔ ”تم وہ شام دکھائی نہیں دیتے۔“

”وہ شام ہوں تو دکھائی دوں۔“ وہ جواب دیتا۔

”تو وہ شام کیا ہوا؟“

”شام ختم۔ اب تو رات پڑ چکی ہے۔ جدا میں کی رات۔“

”اُرے اتنے ہی مر چکے ہو تم اس مرہن را دھا پر۔“ ایلی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔

”شاید تم سمجھ رہے ہو مجھے معلوم نہیں وہ چلایا۔“ ”مجھے معلوم ہے۔“

شام نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”تمہیں ہی کیا۔“ وہ بولا۔ ”سب کو معلوم ہے۔“ سب جانتے ہیں حتیٰ کے ہماری لیبارٹری کا بھنگلی بھی جانتا ہے۔ صرف ہم وہ ہیں۔ رادھا اور میں جو ابھی تک اپنے آپ کو فریب دیئے جا رہے ہیں کہ کوئی نہیں جانتا۔“

”ایک بات پوچھوں۔“ ایلی نے کہا۔

”پوچھو۔“ شام بولا۔

”رادھا میں وہ کوئی خوبی ہے۔ جو تمہیں پسند آگئی ہے۔“

وہ قہقہہ مار کر ہٹنے لگا۔ اور پھر اپنی مست آنکھیں ایلی کی آنکھوں میں ڈال کر کہنے لگا۔

”صرف ایک۔ اور اس ایک خوبی پر ساری دنیا قربان کی جا سکتی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ عورت میں بس یہی خوبی ہوتی ہے جس پر مرد رتا ہے۔ تم تو نفیات پڑھتے ہو تو تمہیں تو جاننا چاہیے۔ باقی جو تاک نقشے اور رنگ کی بات ہے۔ سب باتیں ہیں نہ رہانی باتیں۔“

”کیا واقعی وہ محبت کرتی ہے تم سے۔ پچی محبت۔“

”پچی محبت کا تو اپنے کو پتہ نہیں اللہ پیار کرتی ہے۔ جیسے ماں بچے کو کیا کرتی ہے۔ اس عمر میں ماتا مل گئی اور مجھے کیا چاہئے۔“

”تو کیا ماتا کی تلاش تھی تمہیں۔“

سبھی کو ہوتی ہے۔ کیا تمہیں نہیں!“ وہ ہٹنے لگا۔ ”یار یہ فلسفہ چھوڑو۔ مجھے تو غم کھائے جا رہا ہے اب میں کیا کروں گا۔ ہم کیسے دن گزارا کریں گے۔ پر ماتما کرے ہم دونوں فیل ہو جائیں۔“

شام کی باتیں عجیب تھیں۔ اس کی شخصیت میں عجب مٹھاں تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تمام باتا مل کہہ سکتا تھا جو ایلی کے دل میں بھی تھیں لیکن وہ انہیں زبان پر لانے یا اپنے آپ سے اظہار کرنے سے اچکچا تھا۔ ڈرتا تھا غالباً اسی وجہ سے ایلی کو شام سے محبت تھی۔

اس روز شام کی بات سن کر ایلی نے محسوس کیا جیسے اس نے ایلی کے دل کا راز فاش کر دیا ہو۔ جیسے وہ ایلی کے اس راز سے کما حقہ واقف ہو اور اس بات کو اچھی طرح جانتا ہو کہ ایلی کو شہزادے کیوں محبت تھی۔ اور وہ ایلی کا راز فاش کر رہا تھا۔

رادھا کا ترجمہ بہانہ تھا۔

ایلی کو پسینہ آگیا اس کی زبان بند ہو گئی اس کے بعد نہ جانے شام کیا کہہ رہا تھا۔  
شاید سرسری جسم کی تعریف کر رہا تھا۔ یا اس کے جسم کے خم و یق کی بات کر رہا تھا۔ ایلی  
کے روپ و اس وقت شہزادہ کھڑی تھی۔ اس کی تکھیں نناک تھیں۔ کہہ رہی تھی۔  
”میں نے اس سووے میں کچھ پایا نہیں کھویا ہے۔ ایلی میں نے اپنا آپ کھو دیا  
ہے۔ سمجھی جانتے ہیں کہ میں اپنے آپ سے گئی ہوں۔ ایک تم ہو جس نے آج تک  
اس بات کو نہیں پایا۔“

جی۔ کی ناگزیریں ہو چکی تھی لیکن وہ انہیں تک اسی مرے میں مقیم تھے۔  
اب آخری ایام میں کمرہ بدلنے کا سال ہی پیدائشیں ہوتا تھا۔ بیماری کے ایام میں جی  
کے کی جذباتی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔

جس روز سے ایلی نے اس کا محبت نامہ پڑھا تھا جی کے متعلق ایلی کا نقطہ نظر  
ہی بدل گیا تھا پہلے اس کا خیال تھا کہ جی کے جذبات سے قطعی طور پر عاری ہے۔  
دوستوں سے تو وہ اکثر بہم طور پر اظہار محبت کرتا تھا لیکن ایلی کے انداز کے مطابق وہ  
لڑکیوں سے محبت کرنے کا اہل نہ تھا جو نکہ بنیادی طور پر وہ خود پسند شخص تھا۔ اور جو  
اس حد تک خود پسند ہوا ایلی کے خیال کے مطابق وہ کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن خط  
پڑھنے کے بعد ایلی کے مفروضات کا محل وہرام سے گر چکا تھا۔ اسے کچھ سمجھے میں  
نہیں آیا تھا بہر حال اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ جی کے کے ادلتے بدلتے موڈر  
حقیقت اس راز کی وجہ سے تھے جسے وہ یوں سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ نہ جانے وہ  
کون لڑکی تھی۔ نہ جانے وہ کہاں رہتی تھی۔ نہ جانے وہ دونوں کبھی ملتے بھی تھے یا  
نہیں۔ البتہ ایک بات اس خط سے واضح تھی کہ جی کے اپنی محبوبہ کے سامنے سرگوں  
ہونے کا قائل نہ تھا۔ اس کے انداز میں پر دگی نہ تھی لیکن اس کے باوجود جی کے کے  
جدبات کی شدت دیوانہ کن تھی۔

جس روز وہ ایک دوسرے سے جدا ہونے والے تھے ایلی کے منہ سے بات تک  
گئی۔

”بھیکے۔“ وہ بولا ”مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہاری زندگی میں دکھ کا غصہ اس حد تک  
حاوی ہے میں سمجھتا رہا کہ تمہارا وارو یہ بدمزاجی کا شاہد ہے۔“  
اس پر جی کے کی ناگ یوں تن گئی جیسے کسی نے تلوار نکال لی ہو لیکن وہ خاموش  
رہا۔

”پہلے مجھے تمہاری محبت کا علم نہ تھا۔“ ایلی نے کہا ”لیکن اب میں جانتا ہوں کہ  
تم دکھی ہو۔“  
”خوبی نہیں۔“ جی کے خمیدگی سے بala۔ میرے دکھ کو چھوڑو۔ مجھے تو صرف یہ  
دکھ ہے کہ وہ دکھی ہے۔ اس کے دکھ کا کوئی اندازہ نہیں کر  
سکتا اور \_\_\_\_\_ اور \_\_\_\_\_ جی کے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”اس کے لئے محرومی کے سوا کچھ نہیں کچھ نہیں۔ مجھ سے اس کا دکھ دیکھا نہیں  
جاتا۔“

اس وقت وہ سامان باندھ رہے تھے۔

”کب سے دکھی ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”اول سے“ وہ بولا۔

”ازل سے!“

”ہاں۔ از سے۔“ جی کے نے بڑے دکھ سے کہا۔ صدیاں گزر گئیں۔ سدیاں۔  
اب تو اس بیچاری کی ہدیاں بھی گل سڑ گئی ہیں۔ ایک ڈھانچہ رہ گیا ہے اور وہ صرف  
اسی لئے جی رہی ہے۔ صرف ایک آرزو۔ ایک امید کی زور پر۔“ جی کے کے منہ  
سے ایک سکی سی نکل گئی اور وہ غسل خانے کی طرف دوڑا۔ غالباً وہ یہ نہیں چاہتا تھا  
کہ کہ کوئی اسے اس عالم میں دیکھے۔

ایلی حیرت سے اس کو بھاگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ زندگی کس قدر عجیب ہے۔  
کردار کرنے عجیب تھے اور اس کے سوچے ہوئے خیالات اور پڑھی ہوئی باقیں اور  
سمجھے ہوئے اصول کس قدر غلط تھے۔

باہر میدان میں برگد کے پتے جھپڑ رہے تھے۔ زمین خشک چوں سے بھری تھی۔  
درخت کے تلے سامان رکھے اسفند ٹہل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہی ملامت تھی۔  
سامنے برآمدے میں کلاں ٹیچر چھڑی سنجا لے کھڑا تھا۔

ایلی نے محسوس کیا تھی وہ سب بے بس آپا ہیں ہوں۔ نہ جانے وہ کون تھی جس  
نے کلاں ٹیچر کے ماتھے پر تیوری کنڈہ کر دی تھی جس نے اسفند کو پلپلا ہٹ بخش دی  
تھی نہ جانے وہ کون تھی جس نے کے جی کے تاگ کو وحار دی دی تھی۔ دور کوئی چکی  
ہو نک رہی تھی۔ وہ وہ وہ!

## سیس انویا

گاؤں میں بیٹھے ہوئے ایلی ایک انجانی خوش محسوس کر رہا تھا۔ عرصہ دراز کے  
بعد وہ شہزاد کے پاس جا رہا تھا۔ وہ شہزاد جو علی پور میں سرف اس لئے بیٹھی تھی کہ اسے  
ایلی کے آنے کا انتظار تھا۔ ایلی کو بار بار شام کی بات یاد آ رہی تھی۔ عورت میں صرف  
ایک خوبی ہوتی ہے صرف ایک کوہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اس ایک خوبی کے لئے  
مردا سے چاہتا ہے۔

ہاں۔ شام بیج کہتا تھا۔ عورت میں صرف خوبی ہوتی ہے۔ لیکن شہزاد میں تو  
بیسوں خوبیاں ہیں۔ وہ اتنی دیر سے ایلی کا انتظار کر رہی ہے۔ اس سے محبت کر رہی  
ہے۔ بے لائگ محبت جس میں ہوں کاغذ نہیں اور اس نے اس محبت کے لئے سب  
کچھ کھو دیا ہے۔ کچھ پانے کی امید نہیں۔ اس میں حسن ہے رنگیں ہے جرات ہے۔  
کتنی جرات ہے اس میں۔ ایلی کے لئے وہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار  
ہے لوگوں کی جلی کٹ باقیں سننے کے لئے تیار ہے۔